صفا

١٠

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

جامعۂ اسلامیہ

دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد کا علمی، دینی، ادبی سہ ماہی رسالہ

صفا

○ شمارہ: ۱۰
○ ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم، ۱۴۱۱ھ
○ مطابق:
○ جولائی، اگست، ستمبر، ۱۹۹۰ء

مدیر اعلیٰ
محمد رضوان القاسمی

مدیر
خالد سیف اللہ رحمانی

• سالانہ: -/۴۰ روپے
• معاون خصوصی -/۱۰۰ روپے
• فی پرچہ: -/۱۰ روپے

ناشر: شعبۂ نشر و اشاعت، دار العلوم سبیل السلام
پوسٹ بالاپور، حیدرآباد ۵....۵، انڈیا

فون: ۲۳۹۴۵۰

Form 1

فہرستِ مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

حج ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن ہے۔ جو بدنی عبادت بھی ہے اور مالی بھی، اس میں خصوصیت سے عشق الہٰی کا رنگ غالب ہے۔ حاجی اپنے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت و سکون سے خدا سے اپنے عشق اور اس کے احکام کے سامنے تسلیم و رضا کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ لباس و پوشاک اور اقوال و افعال کی یکسانیت اور ایک ہی موقع پر دنیا کے کونہ کونہ سے مسلمانوں کی آمد اور اجتماع اور اسلامی وحدت اور دینی اخوت کے احساس کو جگاتا اور بیدار کرتا ہے۔ یہ ایک غیر معمولی بلکہ شاید دنیا کا سب سے بڑا عظیم اجتماع ہوتا ہے۔ سعودی حکومت جس کو حرمین شریفین اور حجاج کرام کی خدمت کی سعادت حاصل ہے، نہایت تندہی، اہتمام، جذبہ اکرام اور توجہ کے ساتھ حجاج کی سہولت کا انتظام کرتی ہے، مسجد حرام اور مسجد نبوی کی توسیع کا کام جاری ہے۔ عرفات، مزدلفہ اور منیٰ کے ویرانوں میں چند دنوں کے لئے جس بڑے پیمانہ پر روشنی، پانی، خیموں اور دوسری ضروریات کا نظم کیا جاتا ہے، مڈیکل سہولتیں بہم پہونچائی جاتی ہیں، ٹریفک کنٹرول کیا جاتا ہے اور قدم قدم پر حجاج کو تکلیف اور مشقت سے بچانے کی سعی کی جاتی ہے۔ یہ حسن انتظام بہ ظاہر سعودی حکومت ہی کا حصہ ہے۔

اس کے باوجود اتنے بڑے اجتماع میں بعض چھوٹے بڑے واقعات کا پیش آجانا اور حادثات و سانحات کا رونما ہونا چنداں عجیب نہیں، افسوس کہ اس سال بھی اسی طرح بعض ناشدنی واقعات کی نوبت آگئی، منیٰ کے خیموں میں آگ لگ گئی۔ مگر چونکہ اس وقت حجاج وہاں موجود نہیں تھے اسلئے صرف مالی نقصان ہی ہوا۔ جانی نقصان نہیں ہوا، سرنگ میں بھگدڑ کا جو حادثہ پیش آیا وہ بڑا اندوہناک اور جان لیوا ثابت ہوا، سعودی حکومت کے بیان کے مطابق چودہ سو سے زیادہ اموات ہوئیں، غیر سرکاری ذرائع کے مطابق یہ تعداد ہزاروں تک پہونچتی ہے۔ شہید ہونے والے زیادہ تر حجاج انڈونیشیا اور ترکی سے تعلق رکھتے تھے۔ غفر اللہ لھم

اس واقعہ پر دنیا بھر کے مسلمانوں کا غمزدہ اور متاثر ہونا ایک فطری امر ہے، کون صاحب ایمان ہے جس کو اس واقعہ نے ملول نہ کیا ہو، لیکن ایک قدرتی حادثہ کی ذمہ داری سعودی حکومت پر ڈالنا کسی طرح قرین انصاف اور مناسب نظر نہیں آتا، حقیقت یہ ہے کہ سعودی حکومت حجاج کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی ہے اور قدرتی آفات و حوادث سے نمٹنے کے لئے ممکنہ تدبیروں اور احتیاط میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کرتی، اس کے باوجود قدرت کے طاقت ور ہاتھ کے آگے سب بے بس ہیں۔ اس موقع سے ایران یا کسی اور ملک کا اس واقعہ کو اپنے لئے حیلہ و بہانہ اور سعودی حکومت کو نااہل اور اس کے انتظامات کو ناقص قرار دینا محض ایک سیاسی بازیگری اور امت اسلامیہ کی وحدت میں رخنہ اندازی ہے۔

ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ عراق نے کویت جیسے چھوٹے ملک پر حملہ کر کے اس پر اپنا تسلط قائم کرلیا ہے اور ایک لاکھ فوج کویت میں داخل کر دی ہے، مسلمانان عالم کے لئے یہ نہایت افسوسناک خبر ہے، ایران عراق جنگ کے خاتمہ کے بعد عالم اسلام نے اطمینان کی سانس لیا تھا، لیکن اس حادثہ نے بجا طور پر پھر ان کو بے چین و بے سکون کر دیا ہے۔ کویت ایک ایسا ملک ہے جس پر مذہبی رنگ غالب ہے۔ اس کے ذریعہ اسلامی کاز کی پوری دنیا میں مدد کی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف عراق کا رویہ اسلام کے ساتھ نہایت معاندانہ رہا ہے، وہاں اشتراکیت کو برتری حاصل ہے، جبر واستبداد کی فضا ہے۔ اسلام کی دعوت واقامت کے کاموں پر سخت پابندی ہے۔ عراقی عوام اظہار رائے کی آزادی کے حق سے محروم ہیں۔ خدانخواستہ اگر یہ تسلط زیادہ دنوں تک قائم رہا تو دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے فروغ و سربلندی کے لئے سرگرم عمل تحریکیں، جماعتیں اور ادارے اس مادی مدد سے محروم ہوجائیں گے جو ان کو کویت سے حاصل ہو رہی تھی اور یہاں بھی سرکاری سطح پر مذہب بیزاری کی ایک مہم سی شروع ہوجائے گی جس کا کہ دوسرے کمیونسٹ مسلم ملکوں میں تجربہ ہوچکا ہے۔

مقام تعجب ہے کہ عالم عرب کے سینہ پر اسرائیل کا ناسور اپنی پوری قوت کے ساتھ قائم ہے اور اسکو فوجی اور عسکری اعتبار سے خاصی برتری حاصل ہے۔ اس وقت عربوں کو چاہیئے تھا کہ وہ اپنی پوری توجہ فوجی قوت وطاقت میں اضافہ پر مرکوز رکھتے اور باہم دست وگریباں ہو کر اس قوت کو ضائع نہ کرتے مگر عقل و دانش سے اس محرومی اور حالات ومصالح سے اس بے خبری پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے کہ زمانہ کی ٹھوکروں اور دشمنوں کی پیہم دست اندازیوں نے بھی ان کے دلوں کو نہیں جوڑا اور معمولی اختلافات سے اوپر اٹھ کر سوچنے کا حوصلہ نہیں دیا ہے۔ خدا کرے جلد یہ افتاد ختم ہو اور کویت کی آزادی اور استقلال کا پاس ولحاظ رکھا جائے اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہترین طور پر یہاں سے کام ہوتا رہے۔

یہ امر دنیا کے لئے اب محتاج اظہار نہیں رہا کہ کمیونزم کا مدفن خود اس کے مرقد ہی میں تیار ہو رہا ہے اور اس جابرانہ تحریک کے جتنے بت سوویت روس کی سرزمین میں نصب ہیں۔ اب ایک ایک کر کے ان کا نام ونشان مٹایا جا رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسٹالین اور برزنیف کی شخصیتیں تو پہلے ہی سے کافی ہدف تنقید بنی ہوئی تھیں۔ لیکن اب خود مارکس اور لینن بھی اپنے ہی دیار میں لعن وطعن، غیظ وغضب اور نفرت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، روس کے سرکاری ذرائع ابلاغ کے مطابق " جنوبی جمہوریہ جارجیا کے دو درجن قصبات میں سوویت یونین کے بانی کے مجسمے الٹ دئے گئے ہیں، لتھوانیا میں ان کی ہئیت بگاڑ دی گئی ہے اور یوکرین کے مغربی شہر ترنوپول میں حکم جاری کیا گیا ہے کہ لینن کے تمام مجسمے اکھاڑ کر فروخت کر دیئے جائیں۔" (قومی آواز دہلی ۲۵ جولائی ۱۹۹۰)

غیر فطری طور پر جو نظام انسان پر مسلط کیا جاتا ہے، اس کے متعلق کس قدر بھی پروپگنڈہ کیا جائے اور اسکی پشت پر کتنی بڑی طاقت بھی موجود ہو، انجام کار اس کا یہی حشر ہوتا ہے، یہ

کمیونزم ہے جو اپنی تمام تر مادی قوت کے باوجود اور زبردست فوجی طاقت کے باوصف اپنی موت آپ مر رہا ہے اور اس کے بانیوں اور محرکین کے ساتھ اس کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے والوں کا یہ حقارت آمیز اور اہانت انگیز سلوک ہے ----- اس کے مقابلہ ایک نظر اسلام، فطرت سے اس کی مطابقت اور اسکے ماننے والوں کے اس پر غیر متزلزل ایمان و یقین کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ اسلام نے کبھی استبداد کو راہ نہیں دیا۔ اس نے دین اور مذہب کے معاملہ میں جبر و اکراہ کو منع کیا، اظہار رائے کی آزادی عطا کی اور ایک ایسے انقلاب کو وجود بخشا جس کا تعلق صرف ظاہر ہی کی دنیا سے نہیں تھا، بلکہ اس نے ان کے قلب و ضمیر کے عالم کو بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کا کوئی قانون ایسا نہیں کہ فطرت سلیمہ اسکو قبول نہیں کرتی ہو، اس نے غریبوں اور مزدوروں کے حقوق مقرر فرما دیے مگر دولت و ثروت اور ذاتی املاک پر مکمل تحدید عائد نہیں کی، اس نے عفت و عصمت کو خاص اہمیت دی مگر دوسری طرف نکاح کو آسان فرمایا اور وسعت پیدا کی۔

اس کی ان ہی خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ ہزار آزمائشوں اور ابتلاؤں اور مادی محرومیوں کے باوجود مسلمانوں کا اپنے دین سے جذباتی اور روحانی تعلق اور پیغمبر اسلام سے ان کی محبت اور عقیدت کا رشتہ کبھی کمزور نہ ہوسکا، آج بھی مشرق و مغرب اور شمال و جنوب ان سے عداوت و فساد میں متفق ہے اور دنیا کے کتنے ہی علاقے ہیں کہ اسلام سے ان کی نسبت نے ان کے لئے ہر طرح کے ظلم و بربریت کے لئے جواز پیدا کر دیا ہے مگر آج بھی اسلام اور پیغمبر اسلام ان کی چشم عقیدت کا سرمہ ہیں، یہ اسلام کا ایک ایسا اعجاز ہے جسے ہر چشم بینا کھلے آنکھوں دیکھ سکتی ہے اور خدا کے دین کی اس قوت کو ملاحظہ کر سکتی ہے!

فطرت سے بغاوت کی ایک اور مثال دیکھئے!

قومی آواز نئی دہلی ۲۲\ جولائی سنہ ۱۹۹۰ء ہی کی ایک اطلاع کے مطابق نیو فاؤنڈ لینڈ کے رومن کیتھولک کلیسا کے سربراہ ایک تحقیقاتی رپورٹ کے نتیجہ میں مستعفی ہوگئے ہیں، اس رپورٹ کے مطابق کلیساؤں میں تجرد کی زندگی بسر کرنے والے مذہبی پیشوا جو "راہب کہلاتے ہیں، بچوں کے جنسی استحصال اور فعل خلاف فطرت میں مبتلا پائے گئے۔ اس ٹیم کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایک سو سات کلیسائی راہبوں میں سے تقریبا ایک تہائی ایسے ہیں جو جنسی کج روی میں مبتلا ہیں اور نو عمر لڑکوں کو اپنی شہوت کا نشانہ بناتے رہے ہیں ----- یورپ کے کلیساؤں اور ان کلیسا کے راہبوں اور راہباؤں کی اندرونی غیر اخلاقی حالت اب ان لوگوں کے لئے نئی نہیں رہی، جنہوں نے یورپ کی اخلاقیات کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہے۔ اسطرح کے واقعات ہر گز ناشدنی نہیں ہیں بلکہ یہ عیسائیت کی غیر فطری تعلیمات کا نتیجہ ہیں، نکاح کے دروازہ کو بند کرنا یا معیوب تصور کرنا تجرد کی زندگی کو کار ثواب اور اخروی ترقی کا باعث ٹھہرانا اور انسانی تقاضہ ہائے فطرت کی حلال راہ بند یا اس دائرہ کو تنگ کرنا انسان کو سوائے اس انجام کے کسی اور تک نہیں پہنچا سکتا کہ سماج میں گناہ کی کثرت اور معصیت کا مفہوم ایسی غیر فطری قدغنوں ان واقعات کا پیش آنا نہیں بلکہ پیش نہ آنا محل تعجب ہے!

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات مسلمانوں کے لئے اپنی شریعت پر ایمان کی تازگی کا سامان اور اس کی قانون فطرت سے مطابقت اور ہم آہنگی کا شاہد ہے جس نے مصنوعی زہد تکلف آمیز خدا پرستی کے تصور کو مسترد کیا ہے اور حقیقی خدا پرستی اور انسانی فطرت سے ہم آہنگ زہد وورع کو فروغ دیا ہے۔

عیسائیت کی اسی کمزوری اور تقاضاء انسانی پر قدغنوں نے مغربی دنیا کو عیسائیت کا اس کا ایسا باغی بنا دیا اور افراط و تفریط میں مبتلا کر دیا کہ ان کی فکر خام کا سیل رواں اس وقت تک نہ تھما جب تک کہ نفسانیت اور نفسانی تقاضوں کی تکمیل میں وہ اخلاق و تہذیب اور فطرت و تمدن کی تمام حدوں کو پھاند نہ گئی، یا تو ایک طرف عیسائیت نے ان کو نکاح کے جائز اور فطری عمل سے بھی باز رکھنے کی کوشش کی یا پھر دوسری طرف انکی ہوس پرستی، ہم جنسی جیسی غیر انسانی اور خلاف فطرت فعل تک پہونچ گئی۔

انسانیت کی جبین کو ضرور اس امر پر عرق آلود ہونا چاہئے کہ امریکہ جیسے سائنسی اعتبار سے ترقی یافتہ ملک میں ۲۲\ ۲۳\ ۲۴ جون ۹۰ء کو دنیا کی مشہور ایک سو دو منزلہ فلک بوس عمارت پر چراغاں کیا گیا تاکہ قانونی طور پر ہم جنسی کے لئے جواز حاصل کیا جا سکے اور ہم جنس مردوں اور عورتوں کے خلاف تفریق و امتیاز کے رجحان پر احتجاج کیا جا سکے (قومی آواز ۱۲\ جون سنہ ۹۰ء دہلی) ---- کیا اب بھی اسلام کی اعتدال پسندی میانہ روی اور قانون فطرت سے ہم آہنگی اور رب کائنات سے اس کے رشتہ ونسبت کا اعتراف نہ کیا جائے گا؟ جب کہ سب کو معلوم ہے کہ "ایڈس" جیسے خطرناک مہلک مرض کے اسباب میں سے ایک اہم سبب یہی ہم جنسی ہے، اس خدائی عذاب اور گرفت پر تو کم از کم دنیا کو چوکنا اور ہوشیار ہونا چاہئے۔

صفا کا یہ شمارہ بھی حسب معمول متنوع مضامین سے آراستہ ہے، فقہیات میں بنو ہاشم وسادات کو زکواۃ دینے کے مسئلہ پر ایک عالمانہ تحریر قارئین کے مطالعہ میں آئیگی۔ صفا کی دوسری جلد میں بھی اس موضوع پر ایک تحریر چھپ کر قارئین کی تحسین حاصل کر چکی ہے۔ تیسرے فقہی سمینار منعقدہ بنگلور کی تجاویز بابت اسلامی بینک کاری مرابحہ، غیر سودی امدادی سوسائٹی اور بیع حقوق بھی شریک اشاعت ہے۔ اسلام اور مستشرقین سے متعلق ایک اہم تحریر "مستشرقین اور علم حدیث" اور "پیغمبر اسلام اور یہود" کی دوسری اور آخری قسط کا قارئین مطالعہ کر سکیں گے۔

شخصیات میں ایک تحریر اس بات کو واضح کرے گی کہ شاعر اسلام علامہ اقبال کے ادب و شاعری کا اصل سر چشمہ قرآن حکیم تھا اور یہی سر چشمہ ہے کہ جس نے علامہ کے کلام میں ایک زندہ جاوید تاثیر پیدا کر دی ہے۔ شخصیات ہی کے ذیل میں تبع تابعین کے عہد کی ایک اہم شخصیت "قاضی شریک بن عبداللہ نخعی" پر ایک مفید اور جامع مضمون شریک اشاعت ہے، امید کہ اسے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ عورتوں کے حقوق اور ان کے مقام و مرتبہ کا مسئلہ اس وقت ایک عالمگیر

مسئلہ ہے اس سلسلہ میں اسلام کا اپنا ایک مستقل نقطۂ نظر ہے مختلف اہل علم نے اس کی وضاحت وتشریح کی ہے حالیہ شمارہ میں بھی اس پر ایک مختصر اور مفید تحریر طبع کی جارہی ہے جس سے اس مسئلہ کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔

ادبیات کے تحت اہل ذوق "خواب" کے عنوان سے دو نظموں کا مطالعہ کرینگے جو "غزل" اور "جواب آں غزل" کے مصداق ہونگی۔ سوال و جواب جو "صفا" کا مستقل عنوان ہے اس عنوان کے تحت اس بار مدیر صفا کا فقہی مذاکرہ قارئین کے مطالعہ میں آسکے گا۔ دینی مدارس کے نصاب تعلیم کا مسئلہ عرصہ سے زیر بحث ہے گزشتہ شمارہ میں دارالعلوم سبیل السلام کی طرف سے اس سلسلہ میں ہونے والے کام کی رپورٹ قارئین کی نذر کی گئی تھی، موجودہ شمارہ میں ایک کہنہ مشق استاد اور مدرسہ کے تجربہ کار اور ذمہ دار کی ایک تحریر شریک طباعت ہے امید کہ اس سے روشنی حاصل کی جائے گی۔

یہ دور سرعت رفتار اور عجلت کار کا دور ہے، زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جس میں اس ترقی کا اثر موجود نہ ہو، چنانچہ کتابت وطباعت کے میدان میں بھی بڑی ترقیاں ہوئی ہیں افسوس کہ ہماری اردو زبان اس باب میں پیچھے تھی اور نستعلیق میں ٹائپ اور کمپوزنگ پر قدرت حاصل نہیں ہوپائی تھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مختلف لوگوں کی کوشش کے باوجود عربی زبان کے مماثل جس طرح کا اردو ٹائپ وجود میں آیا لوگوں نے اس کو قبول نہیں کیا۔

مقام شکر ہے کہ اردو کمپیوٹر کی ایجاد نے اس کمی کی تلافی کردی ہے اس وقت اردو کے اکثر بڑے اخبار نے نہایت ہی کامیابی کے ساتھ کمپیوٹر کا استعمال شروع کردیا ہے امید کہ یہ اردو طباعت اور نشرواشاعت میں زبردست انقلاب لائے گا اور مصنفین اور ناشرین کو کاتبوں کی نازک اندامی، سست رفتاری اور ٹال مٹول کی الجھنوں سے نجات مل سکے گی۔ بحمد اللہ صفا کا یہ شمارہ اردو کمپیوٹر پر طبع ہورہا ہے اور اس لحاظ سے آپ کے اس رسالہ کو میری معلومات کی حد تک ہندوستان کے اردو رسائل میں سبقت واولیت حاصل ہورہی ہے خدا کرے یہ تجربہ کامیاب ہو اگر ایسا ہوا تو آپ کا "صفا" آپ کی دیرینہ خواہش کے مطابق ماہ نامہ کی شکل میں طبع ہوسکے گا۔

وللہ الحمد اولا وآخرا۔

****

محمد رضوان القاسمی

۲۹ر محرم ۱۴۱۱ھ

بنو ہاشم و سادات اور صدقات و زکوٰۃ

خالد سیف اللہ رحمانی

مختلف روایتیں موجود ہیں، جن میں آپ نے اہل بیت کے لئے صدقہ کو حرام قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضرت حسن نے زکوۃ کی کھجور منہ میں رکھ لی تو آپ نے اگلوا دیا اور ارشاد فرمایا کہ ہم لوگوں کے لئے صدقہ کی چیزیں کھانا روا نہیں انالانا کل الصدقہ (۱) محصلین زکوۃ (عاملین) کو زکوۃ کی مد سے زکوۃ وصول کرنے کی اجرت ادا کی جائے، یہ خود قرآن مجید سے ثابت ہے (توبہ ۔۹، لیکن اپنے اہل خاندان کو آپ نے اس طور بھی زکوۃ سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی، حضرت عباس عامل زکوۃ کی خدمت حاصل کرنا چاہی تو آپ نے انکار فرما دیا۔ رما کنت لاستعملک علی غسالتہ ذنوب المسلمین (۲) آپ نے بنو ہاشم کے موالی کے لئے بھی زکوۃ کو جائز نہیں رکھا، آپ کے خادم خاص حضرت ابو رافع نے ایک عامل زکوۃ کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہا تاکہ زکوۃ میں سے جو اجرت ان کو ملے، ابو رافع بھی اس میں شریک ہوں، تو آپ نے منع فرما دیا (۳)

جن کے لئے زکوٰۃ ممنوع ہے

آپ نے جن لوگوں کے لئے زکوۃ کو منع کیا ہے، وہ کون لوگ ہیں۔؟ اس میں فقہاء کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے، پانچ خاندان، وہ ہیں کہ ان کے اس ممانعت کے حکم میں داخل ہونے پر اتفاق ہے، آل علی، آل عباس، آل جعفر، آل عقیل اور آل حارث بن عبدالمطلب، حارث کے علاوہ عبدالمطلب کی دوسری اولاد کے سلسلہ پر زکوۃ حرام ہوگیا یا نہیں۔؟ اس میں اختلاف ہے، امام مالک، شافعی اور صحیح تر روایت کے مطابق امام احمد ان کے لئے بھی زکوۃ کو ممنوع قرار دیتے ہیں، جب کہ امام ابو حنیفہ کی رائے اس کے خلاف ہے۔ (۴) چنانچہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ابولہب کی اولاد کو زکوۃ ادا کی جا سکتی ہے کیونکہ بنو ہاشم کے لئے زکوۃ کی حرمت کا حکم بطور شرافت و تعظیم کے ہے۔؟ اس لئے اس کے حقدار وہی لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ کی نصرت و مدد کی تھی، ابولہب چونکہ آپ کی اذیت رسانی کے درپے تھا، اس لئے بنو ابی لہب اس اعزاز کے حقدار نہیں ہیں (۵)

صدقات نافلہ

صدقات نافلہ کے بارے میں عام رجحان یہی ہے کہ بنو ہاشم بھی دوسرے لوگوں کی طرح ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، علامہ بدرالدین عینی نے اس سلسلہ میں فقہاء کی رائیں ان الفاظ میں

نقل کی ہیں۔

واما الصدقتہ علی وجہ الصلہ والتطوع فلاباس وجوز بعض المالکیتہ صدقتہ التطوع لھم وعن احمد، وایتان و عند الشافعیتہ فیھا وجھان(۱)

بطور صلہ رحمی اور نفل کے سادات کو صدقہ دینے میں مضائقہ نہیں۔ بعض مالکیہ نے ان کے لئے صدقہ نفل کو جائز قرار دیا ہے۔ امام احمد نے بھی اس سلسلہ میں دونوں روایتیں ہیں اور فقہاء شوافع کی بھی

مشہور مفسر قرآن ابو عبد اللہ قرطبی کا بیان ہے۔

واختلفوفی جواز صدقتہ التطوع لبنی ھاشم فالذی علیہ جمھور اھل العلم وھوا صحیح ان صدقتہ التطوع لاباس بھا لبنی ھاشم وموالیھم لان علیا العباس وماله رضوان اللہ علیھم تصدقوا وتفوا وقافا علی جماعہ من بنی ھاشم وصدقاتھم الموقوفہ معروفہ مشھورہ(۲)

بنی ہاشم کے لئے صدقات نافلہ کے جواز میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ جمہور کی رائے جو صحیح ہے وہی ہے کہ بنی ہاشم اور ان کے موالی کے لئے صدقہ نفل میں کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ حضرت علی۔ عباس اور فاطمہ نے بنی ہاشم کی ایک جماعت پر صدقہ کیا ہے۔ وقف بھی کیا ہے۔ اور ان کے اوقاف مشہور و معروف ہیں

صدقاتِ واجبہ

زکوہ اور صدقات واجبہ مثلا صدقہ الفطر اور کفارات وغیرہ بنو ہاشم کو دینا جائز نہیں، یہی عام طور پر فقہاء کی رائے ہے، تاہم اس پر امت کا اجماع قرار دینا بھی خلاف حقیقت ہوگا، امام طحاوی نے ابن عباس کی ایک روایت نقل کرنے کے بعد جس سے بنو عبد المطلب کے لئے صدقہ کی حلت معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے بنو ہاشم پر صدقہ کو جائز قرار دیا ہے فذھب قوم الی ھٰذا الحدیث واباحوا الصدقات علی بنی ہاشم (۸) خود ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین بھی اس مسئلہ میں متفق نہیں ہیں، اسلئے اول ہم کو ائمہ اربعہ اور ان کے پیروؤں کے نقطہ نظر پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔

احناف کا نقطۂ نظر

امام ابو حنیفہ سے ایک روایت تو مطلقا بنو ہاشم کو صدقات واجبہ اور صدقات دینے کے جواز کی ہے (۹) ینابیع میں منقول ہے کہ ہاشمی کو اپنی زکوہ دے سکتے ہیں۔ (۱۰) ویسے مشہور ہے کہ یہ رائے قاضی ابو یوسف کی ہے، جن سے ابن سماعہ نے نقل کیا ہے کہ بنو ہاشم کے لئے دوسروں کی زکوہ لینی تو جائز نہیں، لیکن خود بنی ہاشم کی زکوہ لی جا سکتی ہے، وروی ابن سماعتہ عن ابی یوسف ان الزکوہ من بنی ھاشم تحل لبنی ھاشم ولا تحل ذالک من غیرھم لھم (۱۱) امام طحاوی نے امام ابو حنیفہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ۔

لاباس بالصدقات کلھا علی بنی ھاشم وذھب فی ذالک عندنا الی ان الصدقات انما کانت حرمت علیھم من اجل ماجعل لھم فی الخمس من سھم ذوی القربی فلما انقطع ذالک عنھم ورجع الی غیرھم بموت رسول اللہ حل لھم ذالک ماقد کان محرما علیھم من اجل ماقد کان احل لھم (۱۲)

امام طحاوی نے امام صاحب کی یہ رائے قاضی ابو یوسف کے واسطہ سے نقل کی ہے، عام طور پر امام ہمام کی یہی رائے ابو عصمہ سے بھی منقول ہے۔ (۱۳) خود امام طحاوی نے بھی امام صاحب کی اس رائے کو قبول کیا ہے اور کہا ہے " بھذا ناخذ۔ ماضی قریب کے اہل علم میں خاتم المحدثین علامہ سید انور شاہ کشمیری کا بھی یہی نقطہ نظر ہے کہ زکوہ کا لینا دست سوال دراز کرنے سے بہتر ہے، اسلئے فی زمانہ بنو ہاشم وسادات کے لئے زکوہ جائز ہے۔ (۱۴)"

مالکیہ

مالکیہ سے چار بالکل متضاد رائیں منقول ہیں، مطلقاً جائز ہیں، مطلقاً ناجائز ہیں، صدقات واجبہ جائز نہیں صدقات نافلہ جائز ہیں، چوتھے اس کے برعکس کہ صدقات نافلہ ناجائز ہیں، اور صدقات واجبہ جائز۔ امام مالک کا قول مشہور رہا، ہم یہی معلوم ہوتا ہے کہ صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ دونوں ہی ان کے ہاں بنو ہاشم کے لئے جائز نہیں (۱۵) البتہ فقہا و مالکیہ میں ابہری سے بھی منقول ہے کہ اگر خمس کا حصہ بنو ہاشم کے لئے باقی نہ رہے اور وہ اس سے محروم ہوں تو زکوہ ان کے لئے جائز ہوگی (۱۶)

شوافع

شوافع کے ہاں معروف اور معمول یہی ہے کہ صدقات واجبہ سادات کے لئے جائز نہیں، تاہم ابن حجر کو اعتراف ہے کہ بعض شوافع کے نزدیک بھی ان حالات میں کہ بنو ہاشم کے لئے کوئی مد خصوص باقی نہیں رہی، زکوہ لینی جائز ہوگی، وھو وجہ لبعض الشافعیہ۔ (۱۷)۔ بقول علامہ کشمیری کے شاہ ولی اللہ صاحب نے عقد الجید میں یہ نقطہ نظر امام رازی کا نقل کیا ہے (۱۸)۔ فقہاء شوافع میں اصطخری کے بارے میں بھی ابن تیمیہ کی صراحت ملتی ہے کہ وہ موجودہ حالات میں بنو ہاشم کے لئے اسکی اجازت دیتے تھے۔ (۱۹)

حنابلہ

دوسرے فقہاء کی طرح حنابلہ نے بھی ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہوئے سادات و بنو ہاشم کیلئے زکوہ کو منع کیا ہے، لیکن شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ امام ابن تیمیہ جیسے جلیل القدر فقیہ ہیں کہ سادات کے لئے مد مخصوص کے باقی نہ رہنے کی صورت میں زکوہ کا دروازہ ان کے لئے کھولنے کے قائل ہیں، فرماتے ہیں۔

وبنو ھاشم اذا منعوا من خمس الخمس جاز لھم الاخذ من الزکوہ وھو قول القاضی یعقوب وغیرہ من اصحابنا وقالہ ابو یوسف والاصطخری من الشافعیہ لانہ محل حاجہ وضرورہ (۲۰)

بنی ہاشم خمس کے خمس سے محروم کردئے جائیں تو ان کے لئے زکوہ لینی جائز ہے۔ یہی قاضی یعقوب اور ہمارے دوسرے اصحاب کا قول ہے اور یہی بات ابو یوسف نے اور شوافع میں اصطخری نے کہی ہے اسلئے کہ وہ ضرورت اور حاجت کے محل ہیں۔

مذاہب اور دلائل کا خلاصہ

ان تفصیلات سے درج ذیل رائیں منقح ہوتی ہیں۔

۱۔ سادات و بنوہاشم کے لئے مطلقاً زکوۃ حرام ہے، اکثر فقہاء کی یہی رائے ہے اور اس سلسلہ میں وارد ہونے والی احادیث کا ظاہر اور ان کا اطلاق اسکی تائید میں ہے۔

۲۔ بعض حضرات بنوہاشم کے لئے مطلق زکوۃ کو جائز قرار دیتے ہیں، ان کی طرف سے بعض وہ روایات پیش کی جاتی ہیں، جن میں آپ کے بنوہاشم پر صدقہ کرنے کا ذکر ہے۔ طحاوی نے ایسی روایات نقل کی ہیں اور جواب دیا ہے کہ اس سے صدقات نافلہ مراد ہے۔ ہمارے زمانہ کے محققین میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے ایک نیا نکتہ اٹھایا ہے کہ حدیث میں جہاں کہیں حرمت زکوۃ کا ذکر ہے وہاں "ال" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، "ذریت" کا نہیں، قرآن مجید کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آل" سے وہ لوگ مراد ہیں جو آپ کے عہد میں تھے، قیامت تک آنے والے بنوہاشم نہیں، مگر یہ استدلال دو وجوہ سے محل نظر ہے۔ اول تو فقہاء و محدثین نے از سلف تا خلف ال اور ذریت" کے درمیان اس فرق کا ذکر نہیں کیا ہے، اور "ال" سے خود ائمہ اربعہ نے صحیح تر روایت کے مطابق، قیامت تک آنے والے بنوہاشم مراد لئے ہیں نہ ہی عربی لغت کے لحاظ سے ان دونوں الفاظ کے درمیان ایسا کوئی فرق اہل لغت نے کیا ہے، دوسرے حدیث میں صرف "ال" ہی کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے، بلکہ "بنی ہاشم" کی تعبیر کے ساتھ بھی زکوۃ کی ممانعت کا ذکر ہے اور "بنی فلاں" کے کلمہ کا موجودہ اور آئندہ خاندان پر اطلاق عربی زبان میں عام اور معروف ہے۔

۳۔ بعض فقہاء نے بنوہاشم کے لئے خود بنوہاشم کی زکوۃ کو جائز قرار دیا ہے، جیسا کہ امام ابو یوسف اور ایک قول امام ابو حنیفہ کا مذکور ہوا، ان کی دلیلیں یہ ہیں۔

الف۔ حضرت عباس نے آپ سے عرض کیا کہ آپ نے لوگوں کے صدقات ہمارے لئے حرام کردئے ہیں تو کیا ہم میں سے ایک دوسرے کو اپنی زکوۃ دے سکتا ہے، ھل تحل لنا صدقات بعضنا لبعض" ؟ آپ نے فرمایا ہاں (۲۱)

ب۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ آپ نے کچھ سامان خرید کیا اور اسکو نفع کے ساتھ فروخت کیا اور اسکو بنو عبد المطلب کے محتاج لوگوں پر صدقہ کردیا، فتصدق بھا علی ارامل بنی عبد المطلب (۲۲)

ج۔ ابن عباس ہی سے مروی ہے کہ حضرت عباس نے ان کو اونٹ کے سلسلہ میں آپ کے پاس بھیجا تو آپ نے صدقہ کے اونٹوں میں سے عطا فرمایا اعطاھا من الصدقہ"۔ (۲۳) ان میں سے پہلی روایت متکلم فیہ ہے (۲۴) دوسری روایت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صدقات واجبہ میں سے نہیں تھا، چنانچہ خود امام طحاوی نے بھی اسکو صدقات نافلہ ہی پر محمول کیا ہے، تیسری روایت کا منشاء یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بیت المال کے اونٹ میں سے دیا، ظاہر ہے کہ بیت المال میں مختلف مدات کے مویشی ہوا کرتے تھے، مگر چونکہ اکثر جانور زکوۃ کے ہوتے تھے، اسلئے ہوسکتا ہے کہ تغلیباً "اعطاھا من الصدقہ" سے تعبیر کردیا ہو۔

۴۔ چوتھی رائے یہ ہے کہ اصولی طور پر تو سادات کے لئے زکوۃ جائز نہیں، لیکن ایسے حالات میں کہ بیت المال کو مال غنیمت وغیرہ سے حاصل ہونے والی آمدنی کے ایک خمس کا حصہ باقی نہیں رہا ہو، ان کے لئے زکوۃ لینی جائز ہے، جیسا کہ مذکور ہوا کہ ائمہ اربعہ کے متبعین میں مختلف اجلہ فقہاء کی یہی رائے ہے اور خود امام ابو حنیفہ کا ایک قول اس طرح کا موجود ہے، ان کے پیش نظر یہ بات

ہے کہ سادات کے لئے زکوہ کی حرمت کی حکمت یا علت خمس میں ان کا استحقاق ہے، آپ نے فرمایا۔

لایحل لکم اهل البیت من الصدقات شئی انماهی غسالته الایدی و ان لکم فی خمس الخمس لما یغنیکم (۲۵)

تم اہل بیت کے لئے صدقات حلال نہیں کہ یہ ہاتھوں کا دھوونا ہے۔ اور تمہارے لئے مال غنیمت کا خمس حصہ بیت المال کا خمس اذری القربی کا حصہ ہے۔ جو تم کو اس سے بے نیاز کردے گا۔

لہذا اب کہ یہ مد مخصوص باقی نہیں رہی، سادات کو اس سے بھی محروم رکھنا قرین انصاف نہ ہوگا۔

حالات کا تقاضا

ہر چند کہ اس دلیل پر بھی کافی کلام کی گنجائش ہے اور بنیادی اہمیت اس امر کی ہے کہ خمس، کا عوض، اور اس کی حیثیت محض حکمت و مصلحت کی ہے جس کو فقہاء احکام کا مدار نہیں بناتے یا علت کی ہے جس پر حکم کا مدار ہوا کرتا ہے۔ تاہم فی زمانہ سادات کے لئے زکوہ کا دروازہ کھول کر ہی مقصد شریعت، کہ سادات کو ذلت سے بچایا جائے۔ کی تکمیل کی جاسکتی ہے، کیونکہ اب سادات کی اعانت کا جذبہ مفقود ہے اور اسلامی یا غیر اسلامی حکومت میں ان کی مدد کے لئے کوئی خاص حصہ موجود نہیں ہے، اب ان کو زکوہ سے محروم کر کے ایک طرف زکوہ کی ذلت سے بچایا جارہا ہے، لیکن دوسری طرف اس سے بڑی ذلت پر وہ مجبور ہیں کہ دوسروں کے سامنے سوال کا ہاتھ دراز کریں اور دینی مدارس میں تعلیم کا دروازہ ان کے لئے بند کر دیا جائے اور ان کو ہمیشہ علم سے محروم اور پست رہنے پر مجبور کر دیا جائے۔

پس اب سادات کے لئے زکوہ کی اجازت ایک ضرورت بن گئی ہے اور ضرورت کی بناء پر قول ضعیف پر بھی فتوی دیا جاسکتا ہے، علامہ شامی کا بیان ہے۔

نقد ذکر فی حیض البحر فی بحث الوان الدماء اقوالا ضعیفته ثم قال وفی المعراج عن فخر الائمه لوافتی المفتی بشئی من هذا الاقوال فی مواضع الضروره طلباء للتسیر کان حسنا اھ۔ وکذ قال ابویوسف فی لمنی اذا خرج بعد فتورا لشهوه لایحب به الغسل ضعیفا واجازا لعمل به للمسافر اوالضیف الذی خاف الریبته کما سیاتی فی محله وذالک من مواضع الضروره۔

(بحر میں احکام حیض میں دم حیض کے رنگ کی بابت مختلف ضعیف رائیں ذکر کی گئی ہیں، معراج میں فخر الائمہ سے نقل کیا گیا ہے کہ اگر مواقع ضرورت میں طلب سہولت کے لئے کوئی مفتی ان اقوال میں سے کسی قول پر فتوی دیدے تو بہتر ہوگا، امام ابو یوسف نے فتور شہوت کے بعد خروج

منی کی صورت میں کہا ہے کہ غسل واجب نہیں ہوگا، یہ قول ضعیف ہے لیکن مسافر یا مہمان جو تہمت کا خوف رکھتا ہو اگر اس پر عمل کرے، جیسا کہ اپنے موقع پر یہ بحث آئے گی، تو اس کا ایسا کرنا درست ہوگا کہ یہ ضرورت کے مواقع میں سے ہے)۔

خلاصۂ بحث

پس حاصل یہ ہے کہ موجودہ حالات میں سادات کو زکوٰۃ کی رقم دی جا سکتی ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہ قاضی ابو یوسف امام طحاوی، علامہ ابہری مالکی، اصطخری شافعی، امام رازی، علامہ ابن تیمیہ اور ایک قول کے مطابق مالک اور اکابر علماء ہند میں علامہ انور شاہ کشمیری کی رائے ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

****

حواشی وحوالہ جات

حوالہ جات (۱) صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۴۳ (۲) کنز العمال ج ۴ ص ۳۰۹

(۳) ترمذی ج ۱ ص ۸۷، بسند حسن صحیح (۴) رحمتہ الامتہ ص ۴۵، ۴۶

(۵) فتح القدیر ج ۲ ص ۲۱۳ (۶) عمدہ القاری ج ۹ ص ۸۶

(۷) الجامع لاحکام القرآن ج ۸ ص ۱۹۱

(۸) شرح معانی الاثار ج ۱ ص ۲۹۱، باب الصدقہ علی بنی ھاشم

(۹) عمدہ القاری ج ۹ ص ۸۱

(۱۰) احکام القرآن لاحصاص ج ۴ ص ۲۳۵ (۱۱) عمدہ القاری ج ۹ ص ۸۱

(۱۲) طحاوی ج ۱ ص ۳۰۱ (۱۳) عمدہ القاری ج ۹ ص ۸۱

(۱۴) فیض الباری ج ۳ ص ۵۲

(۱۵) فتح الباری ج ۳ ص ۵۴، عمدہ القاری ج ۹ ص ۸۱

(۱۶) الجامع لاحکام القرآن ج ۸ ص ۱۹۱

(۱۷) فتح الباری ج ۳ ص ۳۵۴ (۱۸) فیض الباری ج ۳ ص ۵۲

(۱۹) فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ج ۴ ص ۴۵۶ (۲۰) ایضاً

(۲۱) معرفتہ علوم الحدیث لابی حاکم نیساپوری۔ النوع السابع والثلاثون

(۲۲) طحاوی ج ۱ ص ۲۹۷ (۲۳) ابو داؤد

(۲۴) اعلاء السنن ج ۹ ص ۸۰

(۲۵) طبرانی عن حسن ابن عباس۔ الدرایہ علی الھدایہ ج ۲ ص ۲۰۶۔ "وعوضکم منھا الخمس" کا لفظ جو معروف ہے، وہ صحیح طور پر ثابت نہیں ہے۔ فتح القدیر ج ۲ ص ۲۱۲

تجاویز فقہی سمینار بنگلور

اسلامی بینک کاری ضرورت اور راہنما خطوط

دور حاضر کے مالیاتی اور اقتصادی نظام میں بینک ایک کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ فاضل سرمایہ کو جمع کرکے، مختلف اقتصادی ضروریات کی تکمیل کے لئے اس کے ذریعہ سرمایہ بھی فراہم ہوتا ہے مزید برآں بینکنگ ادارے متعدد ایسی خدمات بھی انجام دیتے ہیں جو تجارت، صنعت اور زراعت کے لئے ناگزیر ہیں۔ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی معاشی جد وجہد اور سرمایہ کاری بھی اس امر کی محتاج ہے کہ وہ موجودہ بینکوں کی طرف رجوع کریں۔ مگر یہ پورا نظام بینکنگ سود کی بنیاد پر قائم ہے، جسے اللہ تعالی کی حکیمانہ شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

حقیقت واقعہ یہ ہیکہ سودی نظام غیر عادلانہ اساس پر قائم ہے۔ سود پر مبنی عقد، سرمایہ دار کا یہ حق تسلیم کرتا ہے کہ وہ ہر حال میں ایک متعین شرح پر منافع وصول کرے، جب کہ صاحب العمل ENTRENEUR کا منافع اس کی اقتصادی جد وجہد کی کامیابی یا ناکامی پر منحصر ہے، اسلام کے نزدیک یہ عقد فاسد ہے کیوں کہ یہ ظلم پر مبنی ہے۔ اسکے علاوہ سود موجودہ زمانہ میں تفریق دولت، اور توفیر سرمایہ۔CONCENTRATION OF WEALTH کا مؤثر ترین ذریعہ بن گیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں موجودہ، معاشرہ میں قرض پر دیئے جانے والے سرمایہ (LOAN CAPITAL) کو جو تسلط اور قاہرانہ حیثیت حاصل ہوگئی ہے اس کا شعور تقریبا سارے ہی اصحاب فکر کو کسی نہ کسی درجہ میں حاصل ہوگیا ہے۔

سود کے مفاسد کا یہ ایک مجمل بیان ہے، اس کے مضر اور ظالمانہ اثرات کا حصر یہاں ممکن نہیں ہے، اللہ تعالی کی حکیمانہ شریعت انسان کی معاشی جد وجہد کی اہمیت کی نہ صرف یہ کہ منکر نہیں ہے بلکہ وہ اس جد وجہد کو ابتغاء فضل اللہ قرار دیتی ہے، یہ شریعت انسانوں کے معاشرہ میں بالعموم اور معاشی جد وجہد کے میدان میں بالخصوص عدل، رحمت، دیانت اور امانت کی نہ صرف مقتضی ہے بلکہ وہ بھی ایسے احکام، اصول اور اقرار بھی فراہم کرتی ہے جن پر ایک صحتمند، عادلانہ اور مشفقانہ نظام معیشت قائم ہوتا ہے، سود کی حرمت فی الحقیقت اسی مقصد کے پیش نظر کی گئی ہے، اسلامی نظام معیشت ظالمانہ مقابلہ اور تنافس کے بدلے باہمی اخوت، عدل اور مساوات اور عام انسانوں کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کی وسیع بنیادوں پر قایم ہے۔

ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کا یہ فرض ہیکہ وہ اپنی معاشی سرگرمیوں کو بھی ان ہی بنیادوں پر استوار کرے تاکہ ایک طرف وہ اس نظام عدل ومساوات کے داعی بن سکیں اور دوسری طرف اپنی معاشی اور معاشرتی زندگی کو بہتر اور مضبوط بنیادوں پر قائم کرسکیں۔

غیر سودی بنیادوں پر بینکنگ کے نظام کے قیام کے لئے شریعت حقہ نے جو اصول اور

ضوابط عطا فرمائے ہیں وہ موجودہ دور کے مسائل کا بہتر حل پیش کرتے ہیں بلکہ ہمارا یقین ھے کہ اپنی کار کردگی کی اعتبار سے وہ موجود طریق تنظیم سے افضل ہیں، ان کے اختیار کرنے سے مسلمانوں کی معاشی حالت بھی بہتر ھوگی اور ایسا عادلانہ معاشرہ قائم ھوگا جس کا سمارا ملک بدرجہ اولی محتاج ھے ، یہ سمینار سمجھتا ھیکہ مضاربت EQUiTY PARTICIPATION مشارکت PARTNERSHIP اور مرابحہ MARK UP PRICING جیسے بنیادی اصولوں پر مبنی ایک قابل عمل اور بہتر نظام بینکنگ قائم کیا جا سکتا ھے ۔ایسا نظام مالیات اور سرمایہ کاری جو ملک کے لئے ایک پیغام بھی ثابت ھو اور قابل عمل نمونہ بھی ۔ البتہ اس سمینار کو اس بات کا مکمل شعور ھیکہ موجودہ عہد کے متعدد مسائل اور سرمایہ کاری کے متعدد وسائل اور معاملات کے پیش نظر ان اصولوں کے انطباق کے لئے انہیں انتھک جدو جہد کرنا ہوگی۔

اسلامی نظام بینکنگ کا خاکہ مرتب کرتے وقت مندرجہ ذیل اصولی ہدایات کو ملحوظ رکھنا ھوگا۔

(1) اسلام سودی نظام تعاقد کی ہر شکل کو حرام قرار دیتا ھے۔

(2) اسلام مالیاتی اور اقتصادی عقد میں جانبین کے لئے عدل کو ضروری شرط قرار دیتا ھے جس کا مقتضی یہ ھیکہ صاحب المال اور صاحب العمل دونوں کے ساتھ عدل ھو، صاحب العمل (مستقرض) نفع میں شریک ھو اور بصورت نقصان وہ اپنی محنت کے اجر سے محروم ہو۔

(3) زر کو وسیلہ سمجھا جائے نہ کہ مطلوب بالذات جس طرح بضائع ضروریہ اور عیش و راحت کے سامان ہوتے ہیں۔

(4) سرمایہ کو اللہ تعالی کی امانت سمجھا جائے اور اس کے ذریعہ انسانوں کی حقیقی ضرورت اور ان کی مالی اور اقتصادی استعداد میں اضافہ کا ذریعہ بنایا جائے ، برعکس موجودہ طریق تصرف کے کہ جہاں سرمایہ کو صاحب المال اور بینک اپنی ازدیاد دولت کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

(5) سرمایہ کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ کمزور اور پسماندہ طبقات کی معاشی حالت میں بہتری ہو اور نامنصفانہ تقسیم اور تفرق دولت میں کمی واقع ھو ۔اس اصول کے پیش نظر اسلامی بینکوں کو سرمایہ کی تقسیم اور فراھمی کرتے وقت ضروریات تحسینات اور کمالیات میں اول الذکر کو ترجیح دینا ہوگا۔اور شرح منافع کے ساتھ اس امر کا بھی لحاظ کرنا ہوگا کہ ملت کے کمزور اور ضعیف صاحبان استعداد کی ھمت افزائی کی جائے۔

(6) ان تمام وسائل تمویل سے احتراز کرنا ہوگا، جو اگرچہ عصر حاضر میں مروج ہیں لیکن خیانت، دھوکہ اور کتمان حقیقت کے شاہ کار ہیں۔

(۷) ان اصولی ہدایات اور اسلامی نظام معیشت و معاشرت کے عمومی مقاصد اسکی اخلاقی روح ، دیانت و صداقت کی عمومی اقدار کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا، تاکہ یہ کوشش محض ایک میکانکی مشق نہ بن جائے ، بلکہ حقیقی معنوں میں جاری نظام منافعت، لوٹ کھسوٹ، نفسانیت کی جگہ پر نظام رحمت اور باہمی خیر سگالی اور تعاون کا آئینہ دار ہو۔

اسی مقصد کے پیش نظر سمینار نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ماہرین اور علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو شریعت کے مذکورہ اصول اور اس کی عمومی ہدایات ملحوظ رکھتے ہوئے ہندوستان کے

حالات اور مسلمانوں کے مسائل کے پیش نظر ایسا نظام مالیات تجویز کرے جو مسلمانوں کی امنگوں اور ان کی پسندیدہ اقدار کا آئینہ دار بھی ہو اور ان کے حقیقی معاشی مسائل کا حل بھی۔

قرارداد ۲ بابت مرابحہ

یہ سمینار منعقدہ ۸ تا ۱۱ جون ۱۹۹۰ء ۱۳ تا ۱۶ ذیقعدہ ۱۴۱۰ھ مرابحہ سے متعلق غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہے۔

(۱) مرابحہ کا فقہاء کے نزدیک ایک متعین مفہوم ہے۔

(۳) مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ عقود و معاملات میں مقاصد کا اعتبار ہوتا ہے محض الفاظ کا اعتبار نہیں ہوتا لہذا مرابحہ کے نام پر جو معاملات مروج ہیں ان کی حقیقت کا اعتبار ہے محض ان کے ناموں کا اعتبار نہیں ہے۔

(۴) اسلامی بینکوں میں استعمال ہونے والی مرابحہ کی شکلیں مرابحہ کی معروف شرطوں کے ساتھ اسی صورت میں جائز ہوگی، جبکہ۔

(الف) بینک کی طرف سے جاری کردہ مخصوص فارم (QUOTATION) میں بینک کے ذریعہ فروخت کی جانے والی اشیاء کی نوعیت، ان کی کیفیت QUALITY اور دوسری ضروری صفات واضح طور پر ذکر کی گئی ہوں تاکہ جہالت اور ابہام کی وجہ سے معاملہ کے ہر دو فریق کے درمیان کسی نزاع کا امکان باقی نہیں رہے، نیز اس قیمت خرید یا لاگت پر بینک کو ملنے والے نفع (قیمت) اسکی ادائیگی کی مدت اور اقساط کی صراحت کر دی گئی ہو۔

(ب) یہ درست نہیں ہوتا کہ معاملہ کرتے وقت یہ کہا جائے کہ اگر نقد خرید اجائے تو یہ قیمت ہوگی اور ادھار خرید اجائے تو دوسری قیمت، یا ادھار کی مدت کے کم از کم یا زیادہ ہونے پر قیمت کی کمی اور زیادتی کا ذکر معاملہ کرتے وقت کیا جائے، بلکہ بینک خریدار کو مطلوبہ سامان کا نمونہ دکھا کر وضاحت کرے کہ اسکی قیمت اتنی مدت میں اتنی قسطوں میں ادا کرنی ہوگی اور بینک کو اسکی لاگت پر اتنا منافع دینا ہوگا۔ (اور یہی بینک سے خریداری کی قیمت ہوگی)۔

قرارداد ۳، غیر سودی امدادی سوسائٹیاں

تیسرے فقہی سمینار میں غیر سودی امدادی اداروں اور ان سے متعلق مسائل پر غور کیا گیا، یہ سمینار غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ۔

(۱) ہندوستانی مسلمانوں کے اقتصادی اور معاشی حالات کے پیش نظر ایسے امدادی مالیاتی اداروں کا قیام ضروری اور مفید ہے جو عامۃ المسلمین سے بلا سود قرض حاصل کریں اور ضرورت مند مسلمانوں کو سود کی ادنی آمیزش کے بغیر قرض فراہم کر سکیں۔

ایسے ادارے دراصل رفاہی اور فلاحی ادارے ہوتے ہیں جن کی بنیاد صلہ، بر و احسان اور تعاون پر ہوتی ہے۔

(۲) قرض خواہوں سے قرض میں دی گئی رقم سے زائد وصول کرنا چاہے، اس کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرلیا جائے ہرگز جائز نہیں اور قرض سے زائد حاصل کی گئی رقم شرعاً سود ہے، لہٰذا ذاتی مفاد یا ادارے کے مفاد یا دیگر رفاہی اسکیموں پر خرچ کرنے کے لئے بھی قرض سے زائد کوئی رقم وصول کرنا جائز نہیں۔ نیز ان اداروں میں جمع شدہ رقوم کو فکسڈ ڈپازٹ میں رکھنا اور ان پر سود حاصل کرنا بھی حرام ہے۔

رہا یہ سوال کہ ایسے اداروں کے انتظامی مصارف کس طرح پورے کئے جائیں تو یہ "فقہی سمینار" اسکے لئے مندرجہ ذیل طریقوں کو درست قرار دیتا ہے۔

(الف) ایسے امدادی مالیاتی اداروں کو کچھ اصحاب خیر ایک ملی ضرورت سمجھ کر محض اللہ تعالی کی خوشنودی کے لئے اپنے خرچوں سے چلائیں یعنی انتظامی اخراجات کا بار یہ اصحاب خیر برداشت کریں، اگر یہ ادارے مسلمانوں میں اپنا یہ اعتماد حاصل کرلیں کہ یہ خالص شرعی حدود میں عام مسلمانوں کی مالی امداد کے لئے اور ان کو سودی لین دین سے بچانے کے لئے کام کررہے ہیں، اور علماء کرام کی رہنمائی بھی ان کو حاصل ہے تو قوی امید ہے کہ اہل ثروت مسلمان ایسے اداروں کے انتظامی مصارف بلکہ ترقیاتی مصارف کے لئے بھی آگے بڑھیں گے۔

(ب) سمینار کی رائے میں ایسے تمام امدادی مالی اداروں کو ہر طور پر یہ کوشش کرنی چاہیے کہ سرمایہ کا کچھ حصہ پیداواری ذرائع میں لگا کر جائز آمدنی حاصل کی جائے اور کم از کم اتنی آمدنی ضرور حاصل کرلی جائے جس سے سوسائٹی کے انتظامی اخراجات پورے کئے جاسکیں۔

(ج) سمینار کے شرکاء میں سے متعدد علماء کی رائے یہ ہے کہ اجرۃ الخدمہ (سروس چارج) یا انتظامی اخراجات (OPERATIONAL EXPENSES) اگرچہ وہ ضروری اور واقعی اخراجات تک محدود ہوں، قرض خواہوں سے نہیں لئے جاسکتے، محض علماء کی رائے میں اگرچہ یہ اصلا جائز ہو لیکن سود کا دروازہ کھل جانے کا خطرہ ہے اسلئے اسے قطعی طور پر ممنوع قرار دیا جانا چاہیے۔

دیگر علماء (شرکاء سمینار) کی رائے میں اس طرح کے اداروں کا قیام مفید اور ضروری ہے، اور اگر اصحاب خیر کی طرف سے تعاون، یا پیداواری ذرائع میں سرمایہ لگا کر بقدر ضرورت جائز آمدنی حاصل کرکے بھی ادارہ چلانا ممکن نہیں ہو تو ادارے کے ضروری اور حقیقی انتظامی اخراجات قرض خواہوں سے وصول کئے جاسکتے ہیں، کہ اس ادائیگی کا کوئی نفع نہ سرمایہ جمع کرنے والوں کو پہونچتا ہے اور نہ ادارہ کے لئے ذریعہ آمدنی ہے۔

ان علماء کی رائے میں ان واقعی اور ضروری اخراجات کے تعین میں اسکا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اصلا قرض کی جو روح شریعت کے پیش نظر ہے، اسکے ساتھ قرض خواہوں سے ان اخراجات کا وصول کرنا میل نہیں کھاتا، لیکن ان اخراجات کے وصول کرنے کی اجازت ناگزیر حالات کی وجہ سے دی جارہی ہے، لہٰذا ان اخراجات کے تعین میں حد درجہ احتیاط برتی جائے۔

ضروری اور واقعی اخراجات محتاط انداز میں متعین کئے جاسکتے ہیں، لیکن اگر حسابی مدت کے پورا ہونے کے بعد یہ معلوم ہو کہ انتظامی اخراجات کی مد میں وصول کی گئی تخمینی رقم حقیقی اخراجات سے زائد ہے تو یہ زائد رقم قرض خواہوں کو ان سے وصول کئے گئے خرچ کے تناسب سے

واپس کردینا شرعاً واجب ہوگا۔

تجاویز متعلقہ خصوصی قرارداد ۲، بیع حقوق

یہ سمینار منعقدہ ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، جون ۱۹۹۰ء حقوق کی خرید وفروخت کے مسئلہ پر کافی غور وخوض کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ۔

(۱) بیع میں مال کی شرط جوھری ہے۔

(۲) مال کی حقیقت نصوص شرعیہ نے متعین نہیں کی ہے پس اسکا اصل مدار ہر عہد کے اس عرف ورواج پر ہے جو شریعت سے متصادم نہ ہو۔ (۳) وہ تمام حقوق جن کی مشروعیت اصالتاً نہیں بلکہ صاحب حق سے کسی ضرر کو دور کرنے کے لئے ہوتی ہے، ایسے حقوق پر عوض لینا جائز نہیں ہے جیسے حق شفعہ۔

(۴) جو حقوق نصوص شرعیہ سے ثابت ہوں البتہ ان سے مالی منفعت متعلق ہوگئی ہو اور عرف میں انکا عوض لینا مروج اور معروف ہوچکا ہو، نیز ان کی حیثیت محض دفع ضرر کی نہ ہو اور وہ شریعت کے عمومی مقاصد ومصالح سے متصادم نہ ہوں ایسے حقوق پر عوض حاصل کرنا جائز اور درست ہے۔

(۵) کون سے حقوق کس نوع میں داخل ہیں اور اس تفصیل کے مطابق عصر حاضر میں مروج کون سے حقوق قابل عوض ہیں اور کون قابل عوض نہیں ہیں اس کی تعیین و تطبیق کے لئے مستند دار الافتاء اور اصحاب فتاوی کی طرف رجوع کیا جائے۔

دینی اور عصری درس گاہوں کے ذمہ داروں سے!

یہ سمینار عربی مدارس کے ذمہ داروں سے درخواست کرتا ھیکہ۔

(۱) طلبہ کو جدید حالات پر احکام شرعیہ کے انطباق کا اھل بنانے کے لئے فقہی سمینار میں آنے والے مسائل اور دوسرے جدید مسائل پر طلباء کا بین المدارس مذاکرہ منعقد کرائے اور اگر مدارس خواھش کرے تو اسلامک فقہ اکیڈمی ایسے مذاکروں میں تعاون کے لئے ممتاز علماء میں سے کسی صاحب سے ایسے مواقع پر شرکت کے لئے درخواست کر سکتی ہے۔

(۲) دینی مدارس کے طلباء کے لئے سمینار یہ بھی مناسب سمجھتا ھیکہ معاشیات اور مختلف عصری علوم کے ماھرین کے محاضرات کا نظم کیا جائے تاکہ طلبہ ان علوم کی مبادیات اور اس کی بنیادی فکر کو سمجھ سکیں اور احکام شرعیہ کو ان سے مربوط کر سکیں اور اسلامک فقہ اکیڈمی۔ اس سلسلے میں ممکن تعاون کے لئے تیار ہے۔

یہ سمینار اس بات کی بھی ضرورت محسوس کرتا ھیکہ عصری درسگاھوں کے طلباء وفضلاء کے لئے ایسے محاضرات اور کیمپس کا نظم کیا جائے کہ اس کے ذریعہ ان کو اسلام کے مختلف شعبوں کی بنیادی تعلیمات، اسلام کے بنیادی اصول قانون، اسلامی قانون کی تاریخ اور اس کی ہر عہد میں انسانیت کی رہنمائی کی صلاحیت اور ضروری اصطلاحات سے واقفف کرایا جائے۔ سمینار کی خواھش ھیکہ اسلامی فقہ اکیڈمی اس سلسلہ میں مناسب اقدام کرے۔

****

پیغمبر اسلام ﷺ اور یہود

خالد سیف اللہ رحمانی

یہود حجاز و یمن میں

یہودیوں کی سرگرمیوں کا اصل مرکز مصر و فلسطین رہا کیا ہے، مصر و فلسطین کے سرسبز و شاداب علاقوں کو چھوڑ کر حجاز کے بیابار، میں۔ یہود کیونکر آئے اور شیرب میں کس طرح آباد ہوئے، اس سلسلہ میں مؤرخین سے دو طرح کی روایتیں منقول ہیں،

ایک یہ کہ حضرت موسیٰ کے عہد میں قوم عمالقہ کے کچھ لوگ حجاز کے علاقہ میں آباد تھے، ان کی سرکوبی کے لئے بنی اسرائیل کے ایک قافلہ کو آپ نے یہاں روانہ کیا، ان حضرات نے عمالقہ کا استیصال کرنے کے بعد ان کے ایک خوبرو شاہزادہ کی جان بخشی کردی اور اس کو زندہ ساتھ لیکر شام پہونچے، اس وقت حضرت موسیٰ کا انتقال ہوچکا تھا۔

چنانچہ بنی اسرائیل نے ان لوگوں کے اس جرم کو اتنا سنگین تصور کیا کہ ان کو وہاں بسنے کی اجازت بھی نہ دی (فلانو ویکم) ناچار یہ حجاز کو واپس آگئے اور وہیں بود و باش اختیار کرلی، یہ ابوالفرج اصبہانی کی روایت ہے جو اغانی میں نقل کی گئی ہے، مگر محققین کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، سہیل کا بیان ہے "لا احب هذا صحیحاً"۔(۱) یہ بات دو وجوہ کے تحت قرین قیاس نہیں، اول اس لئے کہ بنو اسرائیل کی جنگ عمالقہ سے حضرت موسیٰ کی حیات میں ہوئی ہی نہیں، بلکہ آپ کے جانشین یوشع کے عہد میں ہوئی ہے، دوسرے حضرت موسیٰ اور عمالقہ کے علاقہ حجاز میں فرماں روائی کے دور میں خاصا فرق ہے۔

دوسری رائے ہے کہ بخت نصر نے جب فلسطین و شام کے علاقہ پر قبضہ کیا اور پوری اسرائیلی مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور چن چن کر یہودیوں کا قتل عام کیا، اس وقت یہودیوں کے ایک گروہ نے خیبر و مدینہ وغیرہ کی پناہ لی، اور وہیں کے ہورہے، یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے (۲) اور عین ممکن ہے کہ یہودیوں کے اس علاقہ کے انتخاب کی وجہ یہ ہو کہ مشرکین عرب مذہبا بخت نصر سے قریب تھے اور اس لئے اس کی ہلاکت سامانیوں سے مامون تھے۔

پھر مدینہ ہی سے یہودیت "یمن" کے علاقہ میں پہونچی، یمن کا ایک بادشاہ حجاز کی طرف سے گذرا اور مدینہ بھی آیا، بعض دوست قبائل نے بادشاہ سے یہودیوں کی بدسلوکی اور دوسرے باشندگان شہر کے ساتھ نامناسب رویہ کی شکایت کی۔ چنانچہ بادشاہ نے احد کے سامنے پڑاو کیا، یہود کو طلب کیا اور تین سو پچاس افراد کو باندھ کر قتل کرڈالا (قتل منھم ثلاث مائة و خمسین رجلا صبرا) اس موقع سے ایک یہودی بزرگ نے بڑی منت سماجت کی اور بادشاہ کا دل ایسا جیتا کہ کایا پلٹ گئی اور خود بادشاہ نے یہودیت قبول کرلی۔(۳)

اب کہ یہودیت یمن کا سرکاری مذہب بن گیا، ایسا معلوم ہوتا کہ یمن اور عرب کے دوسرے علاقوں میں یہودیت نے ایک طاقتور شکل اختیار کرلی، گویہ یہودیت یمن میں حارث بن عمرو (جد امراء القیس) کے واسطہ سے پہونچی لیکن "ذونواس" کے عہد فرماں روائی میں اس کو ایسا رسوخ حاصل ہوگیا کہ ایک عیسائی راہب اور اس کی دعوت پر لبیک کہنے والے چند خدا پرستوں کو علانیہ نذر آتش کیا گیا، جس کو قرآن نے "اصحاب الاخدود" کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔(۴)

یہ بات قریب قریب تاریخی مسلمات میں ہے کہ انصار مدینہ سے پہلے یہودیوں نے مدینہ میں توطن اختیار کیا، انصار جو اصل میں "یمن" کے علاقہ میں آباد تھے، مشہور سیلاب (سیل العرم) کی تباہی کے بعد مدینہ آئے (۵) اس کا نتیجہ تھا کہ یہود کو مدینہ میں ایک گونہ بالا دستی حاصل تھی اور معاشی، سماجی، سیاسی اور مذہبی ہر اعتبار سے ان کو اونچا سمجھا جاتا تھا۔

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جن اخلاقی کمزوریوں کا بار بار تورات نے ذکر کیا ہے، ہر چند کہ تاریخ کا سینہ ان کو محفوظ نہ رکھ سکا مگر یہاں بھی دراصل وہ اپنے اس مزاج و مذاق کے ساتھ فروکش رہے۔ چنانچہ "قطیون" نامی یہود کا رئیس اعظم اس بے شرمی پر اترا ہوا تھا کہ اوس و خزرج یا خود یہود کی کسی لڑکی کا نکاح ہوتا تو شوہر سے یکجائی سے پہلے یہ شخص اس کے ساتھ شب باشی کرتا، پھر وہ اپنے اصل شوہر کے پاس جاتی، یہ ایسا معمول بن چکا تھا کہ غالباً اس کی قباحت اور شناعت بھی باشندگان شہر کے ذہن سے رخصت ہو چکی تھی، مگر عرب کی نسلی غیرت رنگ لائی اور خزرج کے مالک بن عجلان نامی ایک شخص کی غیرت مند بہن نے خواتین یثرب کی آبرو کے اس غارت گر کو کیفر کردار تک پہونچایا۔

واقعہ یوں ہوا کہ مالک کی بہن کا نکاح ہوا، وہ قوم کی مجلس سے اس بے حجابانہ انداز سے گذری کہ اپنے کپڑے پنڈلیوں سے اوپر اٹھا رکھے تھے، مالک کو یہ ناگوار گذرا اور بہن پر خفگی کا اظہار کیا، بہن اسی موقع کی منتظر تھی، اس نے کہا یہ کیا ہوا۔؟ اس سے بڑھ کر تو وہ مرحلہ ہوگا کہ میں اپنے شوہر کی بجائے "رئیس شہر" کے ساتھ شب بسری کروں گی، بہن نے بھائی کے تار دل کو صحیح وقت پر چھیڑا تھا۔ چنانچہ مالک ایک خاموش تدبیر کے ذریعہ عورتوں کے ساتھ خود بھی زنانہ لباس میں حجرہ خلوت میں جا گھسا اور اس بے شرم انسان کو پایہ انجام تک پہونچا کر شام کو راہ فرار اختیار کی اور شاہ غسان کے ایک ذی اثر مصاحب۔ جو خود بھی خزرجی تھا، ابو جبیلہ سے یہ داستان کہہ سنائی اور کہا کہ اب حجاز واپسی کی ہمت نہیں، چنانچہ ابو جبیلہ مالک کے ساتھ یثرب آیا، سرداران یہود کو جمع کیا اور ایک ایک کا سر قلم کر دیا، اس واقعہ کے بعد پانسہ پلٹ چکا تھا، اور اب مدینہ پر سیاسی غلبہ اوس و خزرج کو حاصل ہو گیا۔ (۶)

مگر بایں ہمہ یہود نے اوس و خزرج کو باہم لڑوا کر سیاسی اعتبار سے اور سود خواری نیز زرخیز نخلستانوں پر قبضہ کے ذریعہ معاشی اعتبار سے بتدریج پھر اپنا ایک مقام بنا لیا تھا، اور آسمانی کتاب کے حامل ہونے کی وجہ سے لوگ مذہبی اعتبار سے بھی ان کو قدر و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے، یہاں تک کہ عورتیں نذر مانتی تھیں کہ ان کے بچے جی رہیں تو انہیں یہودی بنائیں گی۔ "وکان من نسارھم من تنذر اذا ولدت ان عاش ولدھا ان تھودہ لا الیھود عند ھم کان من اھل علم و کتاب"۔ (۷)

چنانچہ ہر چند کہ یہودیت ایک نسلی مذہب ہے جو بنی اسرائیل میں محدود ہے، تبلیغی و دعوتی مذہب نہیں، پھر بھی قبائل اوس و خزرج میں بہت سے لوگوں نے بطور خود یہودیت اختیار کر لی تھی، چنانچہ ابن ھشام نے اسلام کی مخالفت میں سرگرم جن روساء یہود کا ذکر کیا ہے، ان میں سے اکثر قبائل عرب سے تعلق رکھتے ہیں۔ (۸)

یہود اور مسلمانانِ مدینہ

یہود چونکہ ایک الہامی مذہب کے حامل تھے، اور فی الجملہ توحید کے قائل تھے، اس لئے

فطری بات تھی کہ پیغمبر اسلام (ص) بمقابلہ مشرکین کے اہل کتاب۔یہود و نصاریٰ کو اچھی نظر سے دیکھتے تھے ۔اسی لئے شریعت نے کتابی عورت سے نکاح اور ان کے ذبیحہ کو جائز قرار دیا (المائدہ ۔۵)۔یہود عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے ،آپ (ص) نے بھی اس کو مسنون قرار دیا ،۔یہودی نعش کے گذرنے پر آپ (ص) کھڑے ہوے مسلمانوں نے توجہ دلائی کہ یہ۔یہودی کی نعش ہے ، فرمایا وہ بھی انسان تھے ۔مدینہ آنے کے بعد جب تک قبلہ کے متعین صریح حکم نازل نہ ہوگیا اور آپ کے اجتہاد پر موقوف رہا ، آپ نے بیت المقدس کو قبلہ بنایا ، مدینہ میں۔یہود کے مدرسہ "بیت المدارس" کو آپ بنفس نفیس تشریف لے گئے ۔(۹) ایک اسی پر موقوف نہیں ، حدیث صریح ہے کہ "کان یحب موافقتہ اہل الکتاب فی مالم یومر فیہ بشئی"(۱۰)

اسی کا نتیجہ تھا کہ مدینہ تشریف آوری کے بعد آپ نے جو "بین قومی" معاہدہ تحریر فرمایا ، اس میں مسلمان اور مدینہ کے دوسرے قبائل کے ساتھ "یہود" کو بھی صراحتاً شریک رکھا ، اس وثیقہ کے بعض فقروں کا نقل کیا جانا عین مناسب ہوگا۔

ان الیہود یتفقون مع المومنین مادا موامحاربین للیہود دینہم وللمسلمین دینہم واموالہم وانفسہم الا من ظلم واثم فانہ لایوقع الا نفسہ

پھر آپ نے۔یہود کے ہر خاندان ،بنو نجار ، بنو عوف ، بنو حارث ، بنو اوس ، بنو ثعلبہ کا ایک ایک کر کے ذکر فرمایا اور ان کو اس عہد میں شامل فرمایا۔(۱۱) اس معاہدہ نے مسلمان اور۔یہود دونوں فرق پر نہ صرف امن اور بقاء باہم کی ذمہ داری رکھدی بلکہ مدینہ کی حفاظت اور اس کی حفاظت میں ایک دوسرے کی مدد و اعانت کے بھی وہ پابند ہوگئے تھے ،اس کا تقاضا تھا کہ۔یہود صدق دل سے اس معاہدہ پر قائم رہتے اور توحید و حق کی اس پود کو پروان چڑھنے دیتے ۔ مگر یہ امر حد درجہ افسوسناک ہے کہ پیغمبروں اور رسولوں کے ساتھ مخاصمت تضحیک و ایذاء رسانی کی ، ان کی پرانی خو نے پھر انگڑائی لی اور انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا تھا "زفرق تا بقدم" کسی فرق کے بغیر پھر ان کو دہرانا شروع کیا ، جس کا اندازہ قرآن مجید کی ان آیات سے ہوتا ہے جو۔یہودیوں سے متعلق خاص واقعات کی وجہ نازل ہوی یا ان احادیث سے جن میں۔یہودیوں کی اخلاقی حالت کا ذکر ہے ،ان کے اس رویہ کا گہرا تعلق ان کے ایمان اور اعتقاد سے تھا ، وہ کہا کرتے تھے کہ اگر آخرت میں ان کو عذاب ہوا تو بھی چند دنوں ہوگا ، چنانچہ وہ کہتے تھے کہ دنیا کی کل عمر سات ہزار سال ہے ، ہر ہزار سال کے بدلے آخرت میں صرف ایک دن کا یعنی سات دنوں کا عذاب ہوگا ، لن تمسنا النار الا ایاما معدودہ (۱۲) (البقرہ ۹۵)

آیات اللہ کے ساتھ تضحیک کا حال یہ تھا کہ آپ سے کہتے کہ آپ پر ایمان ، ہم اس لئے نہیں لائیں گے کہ وحی لے کر جبرئیل نازل ہوتے ہیں ، جبرئیل سے ہماری پرانی عداوت اور میکائیل سے صداقت و دوستی ہے (۱۳) (بقرہ ۹۷،۹۸) اپنے بارے میں اس درجہ خوش فہم تھے کہ کہتے تھے ، ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں ، نحن ابناء اللہ واحباؤہ "(۱۴) ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا پرانا مذاق شرک مشرکین عرب اور نصرانیوں کی محبت سے پھر عود کر آیا تھا ، چنانچہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ حضرت عزیز کو "ابن اللہ" قرار دیتے تھے ، قرآن کے اس بیان کی دو طرح تائید ہوتی ہے ، ایک تو۔یہودیوں کی پوری تاریخ جس میں ہر زمانہ میں شرک کا اثر موجود ہے ۔ دوسرے قرآن کے اس علانیہ اظہار پر۔یہود کی خاموشی اور ان کا احتجاج نہ کرنا ۔ عربی زبان میں "راعنا" کے معنی ہیں ، ہماری طرف توجہ کیجئے ، صحابہ اپنی طرف آپ کی توجہ کے

طلبگار ہوتے تو اسی کلمہ کے ذریعہ درخواست کرتے، عبرانی زبان میں یہ لفظ برے مفہوم میں آتا ہے، چنانچہ آپ کی مجلس میں آتے تو "راعنا" کہتے اور مضحکہ آمیز ہنسی ہنستے، حضرت سعد بن عبادہ نے کہ ان کی زبان سے کچھ واقف تھے، اس کا احساس کیا اور یہودیوں سے ان کی اس تعبیر پر ناگواری ظاہر کی۔(۱۵)

-----علامہ سیوطی نے سعد بن معاذ کا ذکر کیا ہے، چنانچہ بالاخر آپ پر قرآن نازل ہوا اور صحابہ کو بھی ایسی ذو معنین تعبیر اختیار کرنے کی بجائے "انظرنا" کہنے کا حکم فرمایا گیا۔(البقرہ ۱۰۴)
یہ حضور سے ملتے تو "السلام علیکم" کی جگہ ایک بد دعائیہ کلمہ "السام علیکم" (تم پر موت ہو) کہتے اور لفظی اشتباہ سے دھوکہ دیتے، آپ کمال حلم سے صبر فرماتے اور علیکم کہنے پر اکتفا فرماتے، حضرت عائشہ کے سامنے ایک یہودی نے اسی طرح کہا تو آخر آپ تاب نہ لا سکیں اور برا بھلا کہا۔(۱۶)
آپ نے ہمیشہ یہود کو سنجیدہ طور پر دعوت دینے کی کوشش کی، غزوہ بدر کے بعد آپ نے تلقین کی، اہل مکہ کے انکار و کفر کی وجہ سے خدا کا ان پر جو عتاب ہوا تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، اس لئے تم اسلام قبول کرلو، مگر ان حضرات نے کوئی سنجیدہ جواب دینے کی بجائے کہا کہ ایک ناتجربہ کار اور جنگ سے ناآشنا قوم پر فتحمندی تم کو غرور میں مبتلا نہ کردے۔(۱۷) ایک اور موقع پر جب علماء یہود سے آپ کی گفتگو ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ میں دین ابراھیمی پر ہوں تو انہوں نے ایسا جواب دیا کہ جو یکسر عقل اور واقعات کے خلاف تھا، یعنی یہ کہ ابراہیم بھی یہودی تھے۔(۱۸)
ہر وقت اس بات کے درپے ہوتے کہ انصار و مہاجرین اور انصار کے قبائل اوس و خزرج میں کسی طور دوبارہ جنگ کی آگ بھڑک اٹھے۔ ایک بار ایک سن رسیدہ یہودی مرشاس بن قیس اوس و خزرج کی جنگ کے رجزیہ اشعار سنا کر بالاخر فضاء کو گرم کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا اور فریقین کی طرف سے اسلحہ تک نکل آئے، آپ کی بروقت سعی و کوشش اور موعظت نے اس آگ کو خاکستر کردیا۔(۱۹)
خدا کو تسلیم کرنے کے باوجود خدا کے ساتھ بھی ان کی جسارت حیرت انگیز تھی، قرآن میں ایک موقع پر لطیف پیرایہ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ بندگان خدا خدا کو قرض دیں یعنی اس کے بندوں کی مدد کریں۔ یہ انفاق کی طرف توجہ دلانے کیلئے ایک ایسی لطیف تعبیر ہے کہ اصحاب دانش کو اس پر وجد آجائے، مگر ایک یہودی عالم "فخاص بن عازورا" نے اسی کو خدا کے ساتھ گستاخی کی اساس بنالیا اور کہنے لگا کہ خدا غریب و محتاج اور ہم غنی ہیں کہ اس کو ہمارے قرض کی حاجت ہے، حضرت ابوبکر آخر جوش حق میں اس کو برداشت نہ کرسکے اور اس کو طمانچہ رسید کر ہی دیا۔(۲۰)
اسلام کو نقصان پہونچانے کے لئے طرح طرح کے طریقے اختیار کرتے تورات میں جو علامت ذکر کی گئی ہیں۔ ان کو چھپاتے ان کی غلط تعبیر کرتے اور یہ سب محض اسلئے کہ عوام کے نذر و نیاز کے دروازے ان پر بند نہ ہوجائیں۔(۲۱)
اس سازش کی بھی سعی کی گئی کہ کچھ یہود پہلے مصنوعی طور پر اسلام قبول کریں اور پھر مرتد ہوکر یہودیت کی طرف واپس آجائیں، تاکہ دوسروں کو معلوم ہو کہ یہ دین حق نہیں ہے (۲۲)۔ کمال ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ بمقابلہ پیغمبر اسلام کے مشرکین کا ساتھ دیتے، اور ان کے دین کو اسلام سے فائق و برتر قرار دیتے (۲۳) لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پر تعجب کا کوئی موقع نہیں کہ یہ ان کی مشرکانہ نفسیات کے عین مطابق تھا۔ حقیر و خسیس مقاصد کے لئے احکام الہی میں تحریف ان کے لئے معمولی بات تھی، مدینہ تشریف آوری کے بعد بارگاہ نبوی میں یہودیوں کے زنا کا ایک مقدمہ خود ان کی طرف سے فیصلہ کے لئے پیش ہوا، آپ نے ان سے تورات کا حکم دریافت فرمایا تو کمال خیانت کے ساتھ ان علماء یہود نے رجم کے حکم کو ہاتھ سے ڈھک لیا مگر ایک یہودی عالم (

جواب دامن اسلام میں آچکے تھے) موجود تھے، انہوں نے بروقت ٹوکا اور ان کے جھوٹ کی قلعی کھل گئی۔(۲۴)

مالی لین دین سود اور سود کے معاملہ میں قساوت قلبی اور غرباء کا استحصال ان کا خاص فن تھا، معمولی سی چیزوں کے لئے معصوم بچوں کا قتل کر دیتے اور ان کا زیور چھین لیتے۔ یہودیوں کی اخلاقی گراوٹ کا یہ حال گو ہمیں کتاب و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ محفوظ کوئی اور ماخذ تاریخ ہمارے پاس موجود نہیں تاہم ان کی پشت پر اسرائیل کی وہ پوری تاریخی نفسیات بھی ہے جو خود بائیبل کے بیانات سے ثابت ہے اور ان کے مذہبی اصول و قواعد ہیں، جن کا "تلمود" میں ذکر کیا گیا ہے، ان سطور سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یہود کا کیا کچھ رویہ تھا۔

یہی وہ حالات تھے جن میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان چار جنگیں ہوئی ہیں، غزوہ بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ اور خیبر اور خاص طور پر دو اہم روساء کعب ابن اشرف اور سلام بن ابی الحقیق قتل کئے گئے ہیں، چنانچہ اب ان میں سے ایک ایک پر علاحدہ علاحدہ گفتگو کی جاتی ہے۔

کعب بن اشرف

کعب بن اشرف، یہودیوں کا ممتاز سردار تھا، اس کی ماں بنو نضیر کی تھی اور باپ کا تعلق ایک عرب قبیلہ بنو طئی سے تھا (۲۵)

عرب و یہود سے دو طرفہ رشتہ داری نے یقیناً اس کی حیثیت میں اضافہ کیا ہوگا، اہل سیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت متمول اور صاحب ثروت بھی تھا۔ قد و قامت کے لحاظ سے بھی وجیہ تھا۔ شعر و سخن میں درک رکھتا تھا، اور قادر الکلام شاعر تھا، دولت کا یہ حال تھا کہ مختلف علمائے یہود کو اس کے یہاں سے وظیفہ مقرر تھا، اور وہ اس وظیفہ خواری کی قیمت اس طرح وصول کرتا کہ ان علماء کو اسکی ہر صحیح اور غلط کی تائید کرنی ہوتی، آپ کی آمد کے بعد اس نے ایک دفعہ اپنے وظیفہ خوار علماء سے آپ کے دعوی نبوت کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے آپ کی صداقت کی شہادت دی۔ کعب کو یہ بات گوارہ نہ ہوئی، اور ان کو خالی ہاتھ لوٹا دیا، آخر اس حرص نے ان علماء احبار کو کذب بیانی پر آمادہ کیا اور آپ کی تکذیب کے بعد ہی ان کو مقررہ وظیفہ مل سکا۔(۲۶)

افسوس کہ اپنی دولت و ثروت کے علاوہ شعر گوئی کی قوت کا استعمال بھی یہ ہمیشہ خلاف حق ہی کیا کرتا تھا، مسلمان خواتین پر عشقیہ اشعار کہتا کہ ان کو اذیت پہنچے، خود حضرت عباس کی زوجہ ام فضل کے بارے میں اہل سیر نے اس کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

اراحل انت لم ترحل بمنقبہ   و تارکانت ام الفضل بالحرم (۲۷)

غزوہ بدر کی فتح کے بعد جب آپ نے مدینہ خوشخبری بھیجی اور روساء قریش کے قتل کی اطلاع نے مسلمانوں کو شاد کام کیا، کعب بن اشرف کے لئے اس سے زیادہ کوئی اطلاع تلخ کام نہ تھی، اس نے کہا اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو زمین کا اندرون (یعنی قبر) زمین کی پشت سے بہتر ہے۔ "لبطن الارض خیر من ظہرھا"۔(۲۸) اس نے اپنے اشعار میں خود پیغمبر اسلام (ص) پر بھی ہجو کی اور اسی پر اکتفاء نہ کیا بلکہ غزوہ بدر کے بعد اہل مکہ کو اشتعال دلانے ان کی آتش انتقام کو بھڑکانے اور مسلمانوں

کے خلاف سے جوش و خروش کے ساتھ صف آراء کرنے کی غرض سے مکہ کا سفر کیا اور نہایت جذباتی اور اشتعال انگیز مرثئے کہے اور سنا سنا کر عربوں کی روایتی غیرت کو بھڑکایا۔ (۲۹)
ابن ھشام نے کعب کے بعض مراثی کا ذکر کیا ہے، اس کے ایک مرثیہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے

طھنت رحابدر لمھلک اھلہ ولمثل بدر تستھل و تدمع (۳۰)

یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ عرب کے اس عہد کی شاعری کو آجکل کی شاعری پر قیاس نہ کرنا چاہیے، اس زمانہ میں شعر ہی سب سے بڑا موثر ذریعہ تشہیر تھا، اور کسی قادر الکلام شاعر کا ایک شعر کسی شخص کی کردار کشی کے لئے اس طرح کفایت کرتا تھا، جیسے کہ ہمارے دور میں صحافتی ذرائع سے شائع ہونے والی خبریں، چنانچہ کعب کی یہ ریشہ دوانی ضائع نہ گئی اور شاید اسی کے نتیجہ میں مسلمانوں کی اس چھوٹی سی عسکری قوت کو ایک ہی سال بعد مکہ کی ایک زبردست فوجی طاقت سے (میدان احد میں) نبرد آزمائی کرنی پڑی۔
علاوہ ان اسباب کے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کعب نے بعض یہودیوں کو تیار کیا تھا کہ وہ آپ کو دعوت ولیمہ دیں اور اسی موقع سے آپ کا کام تمام کر دیا جائے (۳۱) اور میرے نزدیک یہود کا آپ کے ساتھ جو رویہ تھا اس کے تحت اس طرح کا اقدام قطعاً خلاف توقع اور ناقابل قیاس نہیں ہے۔
اس عہد شکنی پھر مسلمان عورتوں کی بے آبروئی، آپ کی ہجو اور اہل مکہ کے ساتھ تناصر اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانی کے باوجود اس پر کوئی اقدام نہ کرنا مدینہ کی چھوٹی سی مسلم آبادی کے تحفظ کے لئے زبردست خطرہ بن سکتا تھا، چنانچہ کعب کی مدینہ واپسی کے بعد آپ کی زبان مبارک سے یہ فقرہ نکلا

(۳۲)
اللهم أنفسنی ابن الاشرف بماشئت فی اعلانہ الشر و قولہ الاشعار

بعض مخلص صحابہ جن میں محمد بن مسلمہ پیش پیش تھے، اس مہم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے نہایت حسن تدبیر کے ساتھ اس مہم کو پایہ انجام تک پہونچایا اور کعب بن اشرف کو واصل جہنم کیا، ہر چند کہ اس واقعہ کی تفصیل ذکر کرنی اس وقت مقصود نہیں، لیکن اس واقعہ کا ایک پہلو ایسا ہے کہ جس سے کعب کی اخلاقی حیثیت واضح ہوتی ہے، محمد بن مسلمہ اپنے ساتھیوں کو لے کر کعب کے پاس قرض مانگنے کے بہانہ گئے اور ایک ایسا مبہم جملہ استعمال کیا جس سے بظاہر آپ کی مخالفت معلوم ہوتی تھی، تاکہ کعب کو مطمئن کیا جاسکے۔
اس موقع سے قرض کے لئے کعب نے سامان قرض کے طور پر سب سے پہلے جو چیز طلب کی وہ یہ تھی کہ قرض خواہ اپنی عورتوں کو اس کے حوالہ کردیں، ان حضرات نے حسن تدبیر سے اس مطالبہ کو رد کر دیا اور کہا کہ تم عرب کے خوبصورت ترین آدمی ہو۔ ہمیں خود اپنی عورتوں پر اطمینان نہیں (۳۳) خراسانی کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ "تم خوبصورت آدمی ہو اور عورتوں کے دلدادہ ہو۔۔ انت رجل حسان یحب النساء۔" (۳۴) اس سے کعب کی اخلاقی پستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ خراسانی کی اس روایت سے معلوم ہوتا کہ یہ پہلا واقعہ نہ تھا بلکہ کعب کی عیاشی لوگوں میں معروف و

مسلم تھی، ان تمام حالات کو سامنے رکھ کر کوئی بھی صاحب انصاف اندازہ کر سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا یہ اقدام کس قدر منصفانہ اور واجبی تھا۔

سلام بن ابی الحقیق

جن یہودیوں کو خاص طور پر قتل کرایا گیا، ان میں سے ایک سلام بن ابی حقیق بھی ہے، جو ابورافع کے نام سے معروف تھا، غزوہ خندق کی آگ جن لوگوں نے بھڑکائی تھی، اور مسلمانوں کے خلاف عرب کی پوری قوت کو یکجا کر دیا تھا، ان میں کعب بن اشرف کے بعد دوسری نمایاں شخصیت اسی سلام بن حقیق کی تھی، بنو قریظہ کی مہم کے بعد سلام کا خاتمہ ضروری ہو گیا تھا جو اس وقت خیبر میں مقیم تھا اور جس سے اس امر کا خطرہ درپیش تھا کہ وہ پھر جنگ بنو قریظہ کا انتقام لینے کی غرض سے مہم جوئی کرے اور عربوں اور یہودیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے

انہی حالات کے پیش نظر قبیلہ خزرج کی شاخ بنو سلمہ کے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ و سلم سے اس کے قتل میں پیش قدمی کی اجازت چاہی، آپ نے اجازت دی، لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس مہم میں کسی بچہ یا عورت کا خون نہ ہونے پائے، چنانچہ ایک پانچ نفری قافلہ اس ارادہ سے خیبر گیا اور اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ و سلم کی ہدایت کا پورا پورا پاس و لحاظ کرتے ہوئے اس مہم کو انجام دیا۔ اور سوائے ابورافع کے کسی اور پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔(۳۵)

غور کیا جائے تو مسلمانوں کا یہ اقدام بالکل واجبی اور مبنی بر انصاف تھا، غزوہ خندق کی آگ لگانے میں قائدانہ کردار ادا کر کے ابورافع نے اپنے لئے قتل کا مکمل جواز پیدا کر دیا تھا، پھر پچھلے تجربات کی روشنی میں یہ سوچنا بالکل قرین قیاس تھا کہ ایسے لوگوں کو اگر فرصت مل جائے تو یہ اس کو ضائع کئے بغیر کسی دوسری جنگ کی تیاری میں صرف کریں گے۔ اور مدینہ کی اسلامی مملکت کی صیانت و سلامتی کے لئے زبردست خطرہ بن کر ابھریں گے

بنو قینقاع

یہودیوں میں ایک اہم قبیلہ "بنو قینقاع" کا تھا، زرگری اور تجارت ان کا ذریعہ معاش تھا(۳۶) اس قبیلہ میں لڑنے والوں کی تعداد چھ سو تھی (۳۷)۔ یہودیوں کے دوسرے قبائل بنو نضیر اور بنو قریظہ کا ان سے نباہ نہ تھا، اور آپکی تشریف آوری سے قبل ہی "جنگ بعاث" ہو چکی تھی، جس میں اوس کے ساتھ مل کر بنو نضیر و بنو قریظہ نے بنو قینقاع کے ساتھ بڑا بے دردانہ سلوک روا رکھا تھا،(۳۸) مسلمانوں کی پہلی جنگ اسی قبیلہ بنو قینقاع سے ہوئی۔

بنو قینقاع سے جنگ کا ذکر کرتے ہوئے اکثر مصنفین نے اس کی وجہ بنو قینقاع کی طرف سے معاہدہ شکنی کو قرار دیا ہے (۳۷) لیکن اس عہد شکنی کی تفصیل نہیں ملتی کہ اس سے غزوہ بدر میں مسلمانوں کا عدم تعاون مراد ہے، یا اس کے علاوہ کوئی اور بات بھی ہے اور زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اس عہد شکنی کی کوئی اور صورت بھی پیش آئی ہوگی، کیونکہ مسلمانوں سے تعاون کا ہاتھ کھینچنے میں تمام یہود مشترک تھے، پھر محض اسی ایک قبیلہ کو عہد شکنی کی سزا دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں، علاوہ اس کے ایک اور واقعہ بھی ایسا پیش آیا جو اس جنگ کا باعث ہو گیا، ایک انصاری خاتون بنو قینقاع کے بازار میں اپنا سامان فروخت کرنے گئیں، انہوں نے چہرہ پر نقاب ڈالا ہوا تھا، بنو قینقاع کے نوجوانوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنا چہرہ کھولدیں، مگر وہ اس کے لئے آمادہ نہ ہوئیں، لیکن وہ جس زرگر کی دوکان پر تھیں، اس نے پیچھے سے اسکا کپڑا اوپر کی طرف کو کانٹے سے باندھ دیا۔ کہ اس کو احساس بھی نہ ہو سکا۔ اب جو وہ اٹھیں تو جسم بے پردہ ہو گیا اور نوجوان اس کا استہزاء کرنے لگے، اس بے ہودہ حرکت پر اس نے مسلمانوں کو آواز دی، چنانچہ ایک مسلمان نے اس بے ہودہ

شخص کو قتل کر دیا اور یہود نے اس کی مدد کی اور قاتل کو شہید کر دیا، ایک پیغمبر خدا جس نے مسلمان عورت کے چہرے کو بھی غیر محرم مرد کے لئے حرام کر دیا ہو، اس پر اس بے ہودہ واقعہ کا جو اثر پڑا ہو گا وہ ظاہر ہے۔ مگر روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے پھر بھی صبر و تحمل کا مظاہرہ فرمایا اور نصح و موعظت کی راہ اختیار کی۔

بنو قینقاع کے قبیلہ آئے، اور ان کو دعوت دی، خدا سے ڈرایا، بنو قینقاع کے لئے قبول کرنے اور نہ کرنے کی راہیں کھلی تھیں، اور وہ مسلمان مقتول کے قصاص یا خون بہا پر معاملہ طے کر کے معاہدہ کو باقی رکھ سکتے تھے، مگر انہوں نے خود ہی تصادم کی راہ اختیار کی اور کہنے لگے کہ فنون حرب سے ناواقف اہل مکہ پر فتح کی وجہ سے دھوکہ نہ کھاؤ، ہم تمہیں بتا دیں گے کہ ہم مرد ہیں، (اما واللہ لو حاربتنا لعلمت ان حربنا لیس کحربھم وانا لنحن الناس (۴۰)

گویا خود ان حضرات نے طبل جنگ بجا دیا، چنانچہ مسلمانوں نے فوج کشی کی اور بنو قینقاع کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا، ۱۵ دنوں (۱۵۔ شوال تا یکم ذیقعدہ) کے محاصرہ کے بعد بنو قینقاع نے ہتھیار ڈال دئے اور آپ کے فیصلہ پر راضی ہو گئے، آپ نے خود ان کے حلیف عبد اللہ بن ابی کے مشورہ پر ان کو جلاوطن کر دیا، پس حقیقت یہ ہے کہ بنو قینقاع اپنی عہد شکنی، غیر اخلاقی طرز عمل اور جنگ میں پہل کی وجہ سے اس سے زیادہ سخت سزا کے مستحق تھے، مگر آپ نے اسی پر اکتفا فرمایا۔

بنو نضیر

عمرو بن امیہ ضمری نے منشاء نبوی کے خلاف بنو عامر کے دو افراد کو قتل کر دیا، رسول اللہ پر یہ بات گراں گذری کہ آپ اس وقت تک، کسی کے خلاف طاقت کا استعمال مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ جب تک کہ کوئی اسلام اور مسلمانوں سے کھلے ہوئے تصادم کی راہ اختیار نہ کرے، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ میں ان کی دیت ادا کروں گا۔ "قد قتلت قتلین لادینھما۔(۴۱)

دوسری طرف خود مسلمانوں سے بھی ان کا حلیفانہ معاہدہ تھا، اس کے پیش آپ حضرت ابو بکر، عمر اور علی رضی اللہ عنھم کی رفاقت میں بنو نضیر کو تشریف لے گئے اور ان سے دیت کی ادائیگی میں مدد کی خواہش کی، ان لوگوں نے آپ سے بظاہر پورے توقیر و احترام کا معاملہ کیا مگر بباطن آپ پر قاتلانہ حملہ کی اس طرح سازش کی کہ عین اسی فصیل پر ایک شخص چڑھ کر پتھر کی چٹان گرا دے، جس سے متصل آپ تشریف فرما تھے، اس کے لئے عمرو بن جحاش بن کعب نامی ایک شخص تیار بھی ہو گیا، (۴۲)

بعض لوگ جن میں حضور (ص) کی پیغمبرانہ حیثیت کا ادراک تھا اور جن کے ضمیر میں زندگی اور شرافت کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے، اس سے منع بھی کیا، اہل سیر نے اسی حیثیت سے سلام بن مشکم کا ذکر کیا ہے (۴۱)

ادھر رسول اللہ کو بذریعہ وحی اس کی اطلاع ہو گئی آپ خاموشی سے اٹھے اور اس طرح چلے آئے کہ اپنے رفقاء کو بھی اطلاع نہ کی، یہی اس وقت قرین مصلحت تھا، ادھر آپ آئے اور ادھر سازش کرنے والوں کے پیروں سے زمین نکل گئی۔

بنو نضیر کی اس سازش کی واقفیت پر مسلمانوں کے ایمان کے لئے یہ کافی ہے کہ قرآن خود اس پر شاہد (المائدہ۔ ۵) اور آپ کی زبان حق ترجمان اس پر ناطق ہے، مگر اس سے قطع نظر بھی اس

پر یقین کرنے کے کافی وجوہ موجود ہیں۔ اول یہ کہ جب آپ نے بنو نضیر کو اسی جرم کی پاداش میں شہر بدری کا حکم دیا تو کہیں اس کا ذکر نہیں کہ انہوں نے اس الزام کی تردید کی ہو، اہل سیر سے یہ بات بعید ہے کہ ایسی کوئی بات ہو اور وہ اس کا بالکل ذکر نہ کریں، ہاں یہ ممکن تھا کہ اگر ان کی طرف سے تردید ہوئی ہوتی تو وہ اس کا ذکر کرتے اور ان کی تکذیب بھی کرتے --- دوسرے بعض واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود اس طرح کی حرکتیں کیا کرتے تھے، چنانچہ غزوہ بنو قریظہ کے موقع سے ایک یہودی خاتون محض اس لئے قتل کی گئی کہ اس نے خلاد بن سوید کو ٹھیک اسی طرح شہید کر دیا تھا (۴۴)

یہ تو ایک خاص واقعہ تھا، بعض دوسرے حالات بھی ایسے تھے کہ مدینہ کی اس اسلامی مملکت کی سالمیت کے لئے بنو نضیر کو یہاں سے جلاوطن کیا جانا ضروری تھی، کیونکہ یہ کفار مکہ کے مستقل جاسوس کا فریضہ انجام دیتے تھے، اور قریش کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر بھڑکاتے تھے، موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے۔ "کانوا قد سوائی قریش فی قتال رسول اللہ فحضوھم علی القتال ودلوھم علی العورہ۔۔ (۴۵)

بنو نضیر کے اس معاندانہ طرز عمل نے آپ کے لئے ان کے خلاف فوج کشی کا پورا پورا جواز پیدا کر دیا تھا، مگر آپ نے اب بھی نرم خوئی کو راہ دیا، اور ان کو دس دنوں کی مہلت دی کہ شہر چھوڑ دیں اور جہاں چاہیں چلے جائیں (۴۶) مگر راس المنافقین عبداللہ بن ابی کا ہاتھ ان کی پشت پر تھا، اس نے کہلا بھیجا کہ میرے ساتھ دو معزز آدمی ہیں اور بنو قریظہ بھی تمہاری مدد کو تیار ہیں، تم جنگ کی راہ اختیار کرو (۴۷)

چنانچہ اب آپ کے لئے فوج کشی کے سوا کوئی اور راہ نہ رہ گئی، آپ نے قلعہ بنو نضیر کا چھ شبانہ روز محاصرہ کیا، بالآخر بنو نضیر نے خود درخواست کی کہ ان کو جلاوطن کر دیا جائے اور اونٹ پر جتنا سامان لے جا یا سکے، ساتھ لے جانے کی اجازت دی جائے، آپ نے اسے منظور فرمایا اور پوری آزادی کے ساتھ ان کو اسلحہ کے سوا تمام سامان لے جانے کی اجازت دی۔ یہاں تک کہ مکان توڑ توڑ کر وہ ممکنہ سامان ساتھ اٹھا لے گئے (۴۸)

بنو نضیر کی اشتعال انگیز روش اور مسلمانوں کے تحمل کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات اپنے قلعہ سے اس شان وبان اور آب وتاب سے نکلے جیسے کوئی فتح مند فوج فاتحانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے، نہ چہرے پر ندامت ہے، نہ اپنی سرزمین سے فراق کا بظاہر غم، مطربائیں ساتھ ہیں۔ اور نغمہ و سرود اور شہنائیاں سامعہ نوازی میں مصروف (۴۹) بعض انصار کی اولاد نے بھی یہودیت قبول کرلی تھی جو اس قافلہ کے ساتھ تھے، انصار نے ان کو جبراً روکنا چاہا، مگر اسلام کی رواداری ملاحظہ کی جائے کہ اس دباؤ کو بھی منع کیا گیا اور جبراً مسلمان بنانے اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے کو بھی پسند نہیں کیا گیا، اور آیت قرآنی نازل ہوئی۔ لا اکراہ فی الدین (بقرہ ۲۵)

میرا خیال ہے کہ اہل انصاف اس بات کا اعتراف کریں گے کہ یہاں بھی بنو نضیر کے سازشی سرداروں تک کو بخش دینا اور کفار مکہ کے جاسوس اور منافقین کی پس پردہ مدد کے باوجود صرف ان سے حسب خواہش جلاوطنی کو منظور کر لینا بھی پیغمبر اسلام کی طبعی اور رحمدلی کا نتیجہ تھا، مگر افسوس کہ یہود نے اب بھی سبق نہ لیا اور انہیں سرداران بنو نضیر نے مسلمانوں کے خون سے اپنی طبع خون آشام کو سیراب کرنے کی غرض سے پورے عرب کو ان کے خلاف غزوہ احزاب کی صورت اکٹھا کر دیا۔

بنو قریظہ

مدینہ میں اب یہودیوں کا ایک قبیلہ ہی باقی رہ گیا تھا، مسلمانوں اوران کے درمیان دوبارہ معاہدہ کی تجدید بھی ہوئی تھی اور مسلمان اس پر قائم رہے، مگر ہوا یوں کہ بنو نضیر نے جان بخشی کا صلہ یہ دیا کہ ایک وفد لے کر مکہ پہونچ گئے، اس وفد میں سرداران بنو نضیر سلام بن ابی الحقیق۔ حی بن اخطب، کنانہ بن ربیع اور کچھ دوسرے لوگ شامل تھے، انہوں نے اپنی تائید و حمایت کے مکمل اظہار کے ساتھ اہل مکہ کو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی (۵۰)

جب اہل مکہ تیار ہو گئے تو بنو غطفان کے پاس گئے، ان کو بھی تیار اور آمادہ کیا (۵۱) اور یہ بھی وعدہ کیا کہ خیبر کے نخلستانوں کی کھجور کے نصف حصے ہر سال تمہیں ادا کیا کریں گے، اس طرح ابوسفیان کی زیر کمان اعداء اسلام کا دس ہزار کا اسلحہ و آہن میں غرق لشکر کرہ ارض میں حق و توحید کی چھوٹی سی بستی مدینہ کی خانماں بربادی کے لئے آگے بڑھ رہا تھا، آپ کو اس کی اطلاع ہوئی تو سلمان فارسی کے مشورہ سے خندق کھدوائی اور اس میں آپ نے بنفس نفیس بھی شرکت فرمائی (۵۲) خواتین و بچوں کو مدینہ کے بعض محفوظ قلعوں میں رکھ دیا گیا اور تین ہزار مسلمان مجاہدین خندق کے اس پار صف آراء ہوئے (۵۳) حی بن اخطب بنو قریظہ گیا اور ان کو بھی شریک جنگ ہونے کی دعوت دی، اول تو ان لوگوں نے انکار کیا مگر حی کے اصرار پر یہ بھی قریش اور بنو غطفان کے ساتھ ہو لئے۔ (۵۴)

آنحضور نے جب اس کی تحقیق کے لئے حضرت سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ کو بنو قریظہ کے پاس بھیجا تو ان لوگوں نے نہایت درشتی کے ساتھ جواب دیا اور کسی معاہدہ کے سرے سے ہونے ہی کا انکار کر دیا، حالانکہ ان پر پیغمبر اسلام کا یہ احسان تھا کہ آپ کی آمد سے پہلے بنو نضیر کے مقابلہ ان کی حیثیت کمتر شمار کی جاتی تھی اوران کا خوں بہا ان کے مقابلہ نصف ہوتا تھا، آپ نے دونوں کی دیت برابر قرار دی (۵۵)

خواتین کو جن قلعوں میں محفوظ کیا گیا تھا وہ بنو قریظہ سے بہت قریب تھا اور مردوں میں صرف حسان بن ثابت اس قلعہ میں تھے، بنو قریظہ کی نیت اسی قلعہ پر خراب ہو رہی تھی، حضرت صفیہ کہتی ہیں کہ یہودیوں کے ایک دس نفری گروہ نے قلعہ پر تیر اندازی شروع کر دی اور ان میں کا ایک شخص عین قلعہ کے دروازہ پر آگیا اور قلعہ کے گرد چکر لگانے لگا، ادھر آنحضور اور صحابہ مصروف معرکہ ہیں، حسان اپنی علالت کی وجہ سے اس لائق نہیں تھے کہ دشمن کی سرکوبی کے لئے نکل سکیں، چنانچہ صفیہ خود نکلیں اور ایک ستون (عمود) سے ایسی ضرب لگائی کہ وہ دشمن خدا وہیں ڈھیر ہو گیا، اور اس کا سر کاٹ کر یہود کی طرف پھینک دیا، اس واقعہ نے ان کی ہمت پست کر دی، اور کہنے لگے کہ محمد (ص) نے اپنے لوگوں کو تنہا نہیں چھوڑا ہے۔ (۵۶)

بنو قریظہ کے خطرہ سے آپ نے یہ تدبیر بھی فرمائی کہ سو، تین سو آدمیوں کے رسالے کبھی سلمہ بن اسلم اور کبھی زید بن حارثہ کے زیر کمان ان قلعوں کے قریب روانہ کرتے کہ وہ زور سے نعرہ تکبیر لگائیں تاکہ بنو قریظہ کی ہمت بڑھنے نہ پائے، (۵۷) اگر اس طرح کی تدبیر نہ کی جاتی، اور حضرت صفیہ والا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید یہ قلعہ بنو قریظہ کی زد سے بچ نہ سکتا، غور کرو کہ مسلمانوں کے لئے یہ کس قدر نازک موقع ہے، بیس ہزار دشمنوں کا غرق آہن لشکر جرار پورے ساز و سامان اور اسباب و وسائل کے ساتھ مدینہ کا محاصرہ کیا ہوا ہے، اشیاء خوردنی اور حمل و نقل کی کمی نہیں، عرب کے بڑے بڑے سورما اور تجربہ کار اپنی ترکش شجاعت کا آخری تیر پھینکنے کو تیار ہیں، پڑوس کی آبادیوں نے پیمان وفا توڑ دئے ہیں، مسلمانوں کے درمیان بھی منافقین کا ایک گروہ مسلمانوں کی ہمت شکنی پر کمر بستہ ہے۔ اور عین موقع جنگ پر مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی یہ مختصر سی آبادی صرف تین ہزار مجاہدین پر مشتمل ہے، ہتھیاروں کی کمی ہے، فاقہ مستی

کی آزمائش بھی دوش بدوش ہے، پیٹ پر پتھر بندھے ہیں، رسد بند ہے، باہر سے کسی کمک کی توقع نہیں۔ خواتین اور معصوم بچے ایک علحدہ قلعہ میں محصور ہیں، جن کی حفاظت کا کوئی معقول نظم نہیں، پڑوس میں بنو قریظہ ہیں، جن سے ہمہ دم ان معصوموں کا تحفظ خطرہ میں ہے، صورت حال یہ ہے کہ لوگ قضاء حاجت کے لئے نکلنے کی ہمت نہیں پاتے، پیغمبر اسلام کو جس نماز سے عشق ہے، اور جو بحالت ہوش وحواس کبھی قضاء نہ ہوئی، دشمنوں کی یلغار سے ایک نہیں چار نمازیں قضا ہوجاتی ہیں، عین اسی حالت میں "مردے از غیب بروں آمد" کے مصداق نعیم بن مسعود کو ہدایت ربانی سے سرفراز کیا جاتا ہے، ان کی حسن تدبیر اور منجانب اللہ بعض قدرتی حالات طوفان اور آندھی کے باعث آخر یہ محاصرہ جو تقریباً ۲۴ دنوں سے جاری تھا ٹوٹتا ہے۔

خدا کی مدد اور نصرت ساتھ نہ ہوتی تو مدینہ کی اس مختصر سی آبادی کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی، اور حق کا یہ چراغ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوجاتا، ظاہر ہے یہ سب کچھ بنو نضیر کے جلاوطن اور بنو قریظہ کے معاہد یہودیوں کی فتنہ سامانی اور ریشہ دوانی کا نتیجہ تھا، اس آزمائش سے گذرنے کے بعد ایک طرف عرب کے مشرک قبائل کی کمر ہمت ٹوٹ کر رہ گئی، اور دوسری طرف بنو قریظہ پر حجت تمام ہوگئی۔

اب مسلمانوں کے لئے اپنے تحفظ کے لئے اس کے سواء کوئی چارہ نہ رہا کہ اس "مار آستین" سے نجات حاصل کرلی جائے، چنانچہ اہل مکہ اور بنو غطفان کی واپسی اور غزوہ خندق کے ختم ہوتے ہی آپ (ص) نے بنو قریظہ کی طرف کوچ کیا، حضرت علی (رض) جھنڈا لے کر قلعہ کی فصیل کے قریب پہونچے تو یہودیوں نے علانیہ آپ کی جناب میں گستاخی کی، اور کچھ اس طرح کے کلمات کہے کہ حضرت علی باوجود آپ کے استفسار کے زبان پر نہ لاسکے (۵۸) یہ محاصرہ ۲۵ دنوں تک جاری رہا، اس درمیان سردار قبیلہ کعب بن اسد نے یہودیوں کے سامنے ۳ صورتیں رکھیں، جن میں سے پہلا نکتہ یہ تھا۔

نتابع هذا الرجل ونصدقه فوالله لقد تبين لكم انه لنبي مرسل وانه للذي تجدونه في كتابكم فتامنون على دماءكم وابناءكم ونساءكم

ترجمہ۔ ہم اس شخص کی پیروی کرلیں اور اس پر ایمان لے آئیں خدا کی قسم تم پر یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ وہ نبی ورسول ہیں اور وہی ہیں جن کا ذکر تم اپنی کتابوں میں پاتے ہو اسطرح تم اپنی جان ومال اولاد وخواتین پر امن حاصل کرلوگے۔

مگر یہود کے لئے ہدایت مقدر نہ تھی، انہوں نے کہا کہ ہم تورات کو نہ چھوڑیں گے اور نہ اس کے احکام کو بدلیں گے

لا نفارق حکم التوراه ابدا ولا نستبدل به غیره۔ (۵۹)

آخر مجبور ہو کر بنو قریظہ سرانداز ہوئے اور بعض روایات کے مطابق آپ کو اور بعض روایات کے مطابق سعد بن معاذ کو حکم بنایا، عجب نہیں کہ آپ کو حکم مانا ہو، مگر چونکہ سعد بن معاذ کا قبیلہ اسی بنو قریظہ کا حلیف تھا، بنو قریظہ کو ان سے عدل ورعایت کی زیادہ امید رہی ہو، اس لئے خود آپ نے تحکیم ان کی طرف کردی ہو، بہر حال حضرت سعد نے اپنے فیصلہ سے پہلے ایک بار پھر فریقین سے توثیق کرالی کہ وہ ان کی تحکیم پر راضی ہیں (۶۰) اس کے بعد ہی اپنے فیصلہ کا اعلان فرمایا کہ جنگجوؤں کو قتل کردیا جائے۔ عورتیں اور بچے قید کئے جائیں اور سامان واسباب تقسیم کردئے جائیں (۶۱)

چنانچہ چار سو جوان جنگجو قتل کے لئے گرفتار کئے گئے (۶۲) جو لوگ بنو قریظہ میں بد عہدی سے بچے رہے، ان سے عین معرکہ جنگ میں درگذر کیا گیا، چنانچہ عمرو بن سعد قرظی محاصرہ کے درمیان ہی نکلے، انہوں نے ایک شب خاص مسجد نبوی میں گذاری اور چلے گئے، مسلمانوں نے ان سے کچھ نہ کہا (۶۳) عورتوں میں صرف بنانۃ قرظیہ نامی ایک خاتون پر سزائے موت جاری ہوئی، جس نے خلاد بن سوید کو چکی کا پاٹ اوپر سے گرا کر مار ڈالا تھا۔ آپ نے ان بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی دامن اخلاق نہ چھوڑا، رات میں ان کو قید رکھا گیا، اور ان کے کھانے کے لئے کھجوروں کا نظم کیا گیا، ایک ساتھ ایک کے سامنے دوسرے پر سزائے موت جاری نہ کی گئی کہ یہ زیادہ ایذاء کا باعث ہوتی، ایک ساتھ دو چار آدمی لائے جاتے اور ایک بارگی قتل کئے جاتے۔ (۶۴)

بعض لوگوں کے لئے شخصی سفارش کی گئی، آپ نے ان کی معافی کو منظور کرلیا، ایک صحابی نے جن پر زبیر بن باطا قرظی کے کچھ احسانات تھے، زبیر کے لئے جان بخشی کی درخواست کی، آپ نے منظور فرمائی، زبیر نے کہا۔ اولاد و عیال کے بغیر بقیہ زندگی کا کیا لطف۔؟ آپ نے بال بچوں کی سپردگی بھی قبول کی، پھر زبیر نے مال و اسباب کی بھی خواہش کی، آپ نے اسے بھی قبول فرمایا، مگر اس نے کعب بن لیسار، حی بن اخطب اور عزال بن سموال رئیسان بنو قریظہ کے قتل کی اطلاع سنی تو قتل ہوجانے کی خواہش کی، اس طرح وہ بھی قتل ہوا (۶۵) بنو قریظہ کے ان چار سو نفوس پر سزائے موت کی اجراء کو اکثر مستشرق اہل علم نے آپ کا ظلم قرار دیا ہے، لیکن اگر انصاف کے ساتھ چند نکات کو سامنے رکھا جائے تو کوئی ان کی غلطی میں شک نہیں کرسکتا۔

اول، بنو قریظہ کے سلسلہ میں تین ہی صورتیں اختیار کی جاسکتی تھیں، ایک یہ کہ ان کو جلاوطن کردیا جائے، مگر مسلمان بنو نضیر کی جلاوطنی کا مزا چکھ چکے تھے، اور دیکھ چکے تھے کہ کس طرح انہوں نے احسان مند ہونے کی بجائے پورے عرب کو اسلام کے خلاف لا کھڑا کیا، اب مزید اس کا تجربہ اجتماعی خودکشی کے مترادف ہوتا، دوسری صورت یہ تھی کہ ان سبھوں کو غلام بنادیا جاتا، مگر یہ صورت پہلی صورت سے زیادہ خطرناک ہوتی، مدینہ میں پہلے ہی سے منافقین موجود تھے، جو اندر سے مسلمانوں کی جڑیں کھودنے میں مصروف رہتے تھے، اور یہ طبقہ مسلمانوں کا تابع اور ان کا احسان مند تو ہرگز نہیں ہوتا، البتہ نت نئی سازشوں کا سرچشمہ اور منبع بن جاتا، ان کے بغض و عناد کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ حی بن اخطب قتل سے پہلے آپ (ص) کو علانیہ کہتا ہے کہ مجھے تمہاری عداوت پر کوئی ملامت و افسوس اب بھی نہیں "اما واللہ مالمت نفسی فی عداوتک" (۶۶) اب تیسری صورت یہی تھی کہ ان پر سزائے موت جاری کی جائے تاکہ ان کے فتنہ سے اسلام اور مسلمانوں کو محفوظ رکھا جاسکے۔ پس یہ عین مبنی بر انصاف سزا تھی اور مسلمان اس اقدام پر مجبور تھے

دوم۔ بنو قریظہ کی جنگ میں شرکت مسلمانوں کے خلاف بغاوت کا درجہ رکھتی ہے، اس لئے کہ رسول اللہ ان کے لئے بھی مدینہ کے باشندہ کی حیثیت سے فرمانروا اور رہبر تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے معاملات بھی آپ کے پاس فیصلہ کے لئے لایا کرتے تھے اور بغاوت کی سزا، دنیا کے ہر قانون میں سزائے موت ہے، بعض منصف مزاج مستشرقین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ سر اسٹینلی لین پول کا بیان ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان لوگوں کا جرم مملکت سے غداری تھا، وہ بھی ایک محاصرہ کے دوران جن لوگوں نے تاریخ میں یہ پڑھا ہے کہ ولنگٹن کی فوج جس راستہ سے گذری اس کی نشاندہی مفرور سپاہیوں اور لوٹ مار کرنے والوں کی لاشیں کرتی تھیں۔ جو درختوں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ انہیں ایک غدار قبیلہ کے ایک سرسری فیصلہ کی رو سے قتل کئے جانے پر متعجب نہیں ہونا چاہیے۔ (۶۷)

سوم۔ یہ فیصلہ خود ان کے تسلیم شدہ حکم کا تھا، پیغمبر اسلام کا نہ تھا، اور حکم کے ذریعہ جو فیصلہ ہوا اس کے ذمہ دار اصولی طور پر خود وہ فریق ہوتے ہیں، جنہوں نے اس تحکیم کو قبول کیا ہو۔

چہارم۔ یہ فیصلہ خود ان کے مذہب اور مذہبی کتاب، تورات کے عین مطابق تھا، تورات کا بیان ہے

"جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہونچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دینا اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لئے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باجگذار بن کر تیری خدمت کریں اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے بلکہ تجھ سے لڑنا چاہے تو تو اس کا محاصرہ کرنا اور جب خداوند تیرے خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا، لیکن عورتوں اور بال بچوں نیز چوپایوں اور شہر کے سب مال اور لوٹ اور تم اس دشمنوں کی اس لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے دی ہو کھانا۔ (استثناء ۲۰-۱۰-۱۵)

چنانچہ بائبل کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء بنی اسرائیل مختلف مواقع پر اسی حکم کے مطابق عمل کرتے رہے (گنتی ۳۱-۷-۱۰)۔ بنو قریظہ کے اس انجام نے خود مسلمانوں کی صف میں گھسے ہوئے منافقین کی قوت بھی توڑ دی اور اہل مکہ اور مدینہ کے معاندین اسلام کے درمیان جو ربط تھا اور جو مختلف جنگی مہمات اور حوادث کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا وہ ربط بھی باقی نہ رہا اور پھر اہل مکہ سے جنگ کی نوبت نہ آئی اور کسی کشت و خون کے بغیر حرم مکہ چند ہی سالوں میں مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

غزوۂ خیبر

یہود سے مسلمانوں کا آخری معرکہ خیبر کے موقع سے ہوا۔ خیبر مدینہ سے ۶ میل کے فاصلہ پر ایک بڑا شہر تھا، جہاں عالیشان قلعے زرخیز کھیت اور سبزہ زار نخلستان تھے (۶۸) مضبوط اور مستحکم قلعوں میں دس ہزار جنگجو موجود تھے (۶۹) اور مدینہ کے مار آستین اور مسلمانوں کی صف میں گھسے ہوئے مسلمانوں کے بدترین دشمن عبداللہ بن ابی بن سلول سے بھی ان کا خفیہ ربط برابر قائم تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ غزوہ خیبر کے موقع سے بھی اس نے یہودیوں کو پیغام بھیجا کہ تم مسلمانوں سے ڈرو نہیں اور مقابلہ کرو، مسلمان تعداد میں بھی کم ہیں اور ان کے پاس اسلحہ بھی تمہارے مقابلہ تھوڑا ہے (۷۰) خیبر کے یہودیوں نے بڑی تعداد میں اس زمانہ کے ترقی یافتہ اسلحہ منجنیق، دبابے، زرہیں اور تلوار جمع کیا ہوا تھا (۷۱) چنانچہ صرف دو قلعوں "وطیح اور" سلالم، ہی ہیں۔ مسلمانوں کو سو زرہیں، چار سو تلواریں، ایک ہزار نیزے اور پانچ سو عربی تیر و کمان حاصل ہوئے (سیرت حلبیہ ج ۲ ص ۷۴۵) سرمایہ جو جنگ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے، وافر مقدار میں ان کے پاس موجود تھا اور اسکو دفینوں کی صورت وہ محفوظ کئے ہوئے تھے (۷۲)، وہ بنو نضیر کے جلاوطن قائد بن حی بن اخطاب اور فرزندان ابوالحقیق جن کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے پرانی عداوت تھی، بھی انہیں قلعوں میں فروکش تھے (۷۳)۔ بنو غطفان جیسے طاقتور اور مضبوط قبیلہ سے۔ یہود نے دفاعی معاہدہ بھی کر رکھا تھا، چنانچہ غزوہ خیبر کے موقع سے۔ بنو غطفان بھی۔ یہود کی مدد کے لئے نکل آئے تھے مگر اپنے داخلی حالات اور خلفشار کی وجہ سے ان کو اسکی ہمت نہ

ہو سکی (۴،۷) اس طرح مسلمانان مدینہ دو طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں تھے، ایک طرف کفار مکہ تھے اور دوسری طرف یہود خیبر۔

۔یہودیوں کی یہ عددی قوت، اسلحہ کا ذخیرہ، سرمایہ کی بہتات، منافقین اور اعداء اسلام سے ان کا خفیہ ربط، بنو غطفان سے دفاعی اتحاد، سرداران بنو نضیر کی اسلام سے قدیم چشمک، مضبوط و مستحکم قلعے اور غذائی اشیاء کے معاملہ میں خود کفالت اور ان کے قدیم سازشی مزاج و مذاق نے بجا طور مسلمانوں کو وحشت و اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا، وہ اس اندیشہ میں حق بجانب تھے کہ پھر کہیں یہ صورت حال کسی نئے غزوہ خندق کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔

چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد کہ اہل مکہ کی طرف سے ایک گونہ اطمینان حاصل ہو چکا تھا، آپ نے چودہ سو پیادہ اور دو سو سوار سپاہیوں کے ساتھ خیبر کی طرف کوچ فرمایا (۵،۷) خیبر کے قریب پہونچے تو وہ دعا فرمائی جو مزاج نبوت اور کسی سپہ سالار کے درمیان امتیاز قائم کرتا ہے کہ

اللھم رب السماوات وما اظللن ورب الارضین وما اقللن ورب الشیاطین وما اضللن ورب الریاح وما اذرین فانا نسئلک خیر ھذہ القریہ وخیر اھلھا وخیر مافیھا ونعوذبک من شرھا وشر اھلھا وشر ما فیھا (۶،۷)

ترجمہ خداوندا آسمانوں کے پروردگار اور ان تمام چیزوں کے جن پر آسمان سایہ فگن ہے زمین اور ان تمام چیزوں کے رب جن کو زمین نے اٹھا رکھا ہے، شیاطین کے رب اور ان تمام لوگوں کے جن کو شیاطین نے گمراہ کیا ہے ہواؤں کے رب اور جنکو ہوائیں اڑاتی ہیں ہم آپ سے اس جگہ کے اور یہاں باشندوں کے خیر کے طالب اور یہاں کے باشندوں اور تمام چیزوں کے شر سے پناہ کے خواہاں ہیں۔

ہر چند کہ لشکر اسلام شب ہی میں اپنی منزل کو پہونچ چکا تھا، مگر آپ (ص) نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق شب خون نہ مارا اور صبح کا انتظار فرمایا (۷،۷) عین معرکہ جنگ میں بھی امانت و دیانت کا اس درجہ پاس رکھا کہ یہود کا ایک غلام بکروں کے ایک گلہ کے ساتھ خدمت اقدس میں آیا اور مشرف بہ ایمان ہوا تو فرمایا کہ بکریاں قلعہ کی جانب ہنکادی جائیں تاکہ وہ اپنے مالک کے پاس چلی جائیں (۸،۷) یہودیوں کے اکثر قلعے بذریعہ جنگ اور دو قلعے بذریعہ صلح فتح ہوئے۔

قموص نامی قلعہ فتح ہوا، تو اس میں حضرت صفیہ اور ان کی چچازاد بہن قید ہوئیں، حضرت بلال ان دونوں کو لے کر مقتولین یہود کے پاس سے گذرے، حضرت صفیہ کی بہن نعشوں کو دیکھ کر رونے لگیں، حضور کو حضرت بلال کا یہ عمل پسند نہ آیا اور تنبیہ فرمائی کہ تم خواتین کو ان کے مرد مقتولوں کے سامنے سے لے کر گذرتے ہو، کیا تمہارے اندر رحم نہیں ہے؟ (۹،۷)

اہل خیبر سے آپ کا یہ معاہدہ طے پایا کہ ان کی جان بخشی کر دی جائے گی، البتہ وہ یہاں سے چلے جائیں گے، لیکن پھر اہل خیبر نے خواہش کی کہ ان کو یہیں رہنے دیا جائے اور وہ خیبر کی پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کیا کریں گے، آپ نے ان کی اس خواہش کو بھی مان لیا البتہ یہ بات واضح فرمادی کہ جب بھی آپ مناسب سمجھیں گے، ان کو شہر بدر کر دینے کے حقدار ہوں گے (۸۰)

جب آپ یہودیوں کی طرف سے مطمئن ہو گئے تو سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے ایک بکری پکائی اور دست کے حصہ میں، جو آپ کو زیادہ مرغوب تھا، اچھی طرح زہر پیوست کر دیا، اور خدمت اقدس میں پیش کیا، لقمہ منہ میں رکھتے ہی آپ نے اسکا احساس فرمایا، البتہ حضرت

مستشرقین اور علم حدیث

مولانا حسنین احمد ندوی

مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جن علوم وفنون پر بہت زیادہ لکھا ہے اور اسے خاص طور سے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے، ان میں سرفہرست علم حدیث ہے، علم حدیث پر لکھنے والے مشہور مستشرقین یہ ہیں، اے آر گب A R GIBB، گولڈ زیہر GOLDZIHER، مارگولیوتھ MORGOLIOUTH، لیمنس LAMMENS، جوزف شاخت J SHACHT، ڈوزی DOZY، اسپرنگر SPRENGER، ولنسک WENSINCK، بروکلمان BROCKELMANN، نولویکی NOLDKETHESDAR، ولیم میور WILLIAM MUIR، فواد مزگیں، اچ رتر H RITTER۔

ان مستشرقین نے احادیث پر مختلف قسم کے اعتراض کئے ہیں، جنکا ماحصل یہ ہے،

(۱) تدوین حدیث کا کام چونکہ سو سال بعد یعنی دوسری صدی ھجری میں شروع ہوا، اس سے مسلمانوں کو احادیث کی ذخیرہ میں کمی بیشی کرنے اور اسے اپنے اغراض کے مطابق گھڑ لینے کا موقع ملا، یہی وجہ ہے کہ احادیث چاہے صحیح ترین کتب میں پائی جاتی ہوں اور انکی صحت علماء اسلام کے نزدیک کتنی ہی ثابت شدہ کیوں نہ ہو، قلیل ترین تعداد کے علاوہ سب کی سب موضوع اور جالی ہیں۔

(۲) احادیث کے ذخیرہ کو موضوع اور نقلی حدیثوں سے پاک کرنے کے لئے علماء نے جو کوششیں کیں وہ کامیاب ثابت نہ ہو سکیں، اسلئے کہ انہوں نے متن حدیث پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

(۳) احادیث کی اسناد انتہائی لاپرواہی سے مرتب کر دی گئی ہیں، اسطرح کہ قدیم مستند شخصیت کے منھ میں اپنا پسندیدہ نظریہ وخیال ڈال کر اسے کسی بھی سند میں شامل کر دیا گیا ہے۔

مستشرقین نے احادیث سے متعلق جو سوالات اٹھائے ہیں واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام تر انکے جہل اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے یا پھر وہ اسکے ذریعہ عام لوگوں کے ذہنوں کی حدیث سے متعلق پراگندہ کرنے کی کوشش کی ہے، جو عربی سے ناواقفیت یا کسی اور وجہ سے اس فن سے واقف نہیں ہیں، اب ہم تفصیل سے مذکورہ تینوں سوالوں کا جائزہ لیں گے جسکی روشنی میں آپ خود یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ سوالات کس حد تک بے معنی ہیں۔

تدوینِ حدیث

یہ ایک حقیقت ہے کہ احادیث کی ترتیب وتدوین کا کام باضابطہ طور پر ۱۰۱ھ سے شروع ہوا جبکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے دور خلافت میں تمام گورنروں کو یہ ہدایت بھیجی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو تحریری طور پر جمع کرائیں تاکہ یہ علم کہیں صاحب علم کے ساتھ

رخصت نہ ہوجائے، چنانچہ آپ نے مدینہ کے گورنر کو یہ ہدایت بھیجی

انظر ماکان من حدیث رسول اللہ فاکتبہ فانی خفت دروس العلم و ذھاب اھلہ (۱)

رسول اللہ (ص) کی جو حدیثیں بھی ملیں انھیں لکھ لو، مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اھل علم کے ساتھ ساتھ یہ علم بھی اس دنیا سے رخصت نہ ہوجائے۔

عن سعید بن ابراھیم قال امرنا عمر بن عبدالعزیز بجمع السنن فکتبناھا دفترا دفترا، فبعث الی کل ارض لہ علیھا سلطان دفترا (۲)

سعید بن ابراھیم بیان کرتے ہے کہ ہمیں رسول اللہ (ص) نے احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا، چنانچہ ہم نے دفتر کے دفتر مرتب کئے اور پھر اسے سارے ملک میں بھیج دیا۔

تدوین حدیث کا کام باضابطہ طور عہد رسول میں شروع نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس وقت قرآن کا نزول ہورہا تھا اور تمام تر توجہ اس کے لکھنے اور محفوظ کرنے پر لگی ہوئی تھی، دوسرے اس وقت اگر احادیث کے لکھنے کا بھی اہتمام کیا جاتا تو اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ کوئی حدیث قرآن کے ساتھ مل جائے، اس وجہ سے ابتداء میں خود رسول اللہ نے احادیث کے لکھنے سے منع فرمادیا، البتہ اسے زبانی بیان کرنے کی بجازت دی، چنانچہ آپ نے فرمایا

لاتکتبو عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ ، وحد ثو عنی ولا حرج (۳)

میری باتیں مت لکھو، جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا اسے چاہئے کہ اسے مٹادے، البتہ میری باتیں بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اسطرح وقتی مصلحت کے پیش نظر آپ نے احادیث کے لکھنے سے منع فرمادیا لیکن اسے یاد رکھنے اور دوسروں تک پہنچانے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ لوگوں کو اس پر ابھارا۔

نضر اللہ امرا سمع مقالتی فحفظھا ووعاھا ، فاداھا کما سمع ، فرب مبلغ اوعی من سامع (۴)
الا لیبلغ الشاھد منکم الغائب (۵)

اللہ تعالی نے اس شخص کو سرسبز وشاداب رکھے جس نے میری بات سنی، اسے یاد کیا اور سمجھا، پھر اسے ویسے ہی دوسرے تک پہنچایا ہو سکتا ہے کہ سننے والے سے زیادہ ہوشیار وہ شخص ہو جس تک میری بات پہنچی۔

تم میں کا ہر موجود اس شخص تک میری بات پہنچادے جو یہاں نہیں ہے

جمع قرآن کا خاص اہتمام اور اس سلسلہ میں غیر معمولی احتیاط کہ کہیں حدیث کا کوئی ٹکڑا قرآن کے ساتھ نہ مل جائے، عہد نبوی کے بعد بھی کچھ دنوں تک باقی رہا، چنانچہ حضرت ابوبکر (رض) نے کچھ احادیث ایک جگہ جمع کیں اور پھر اسی اندیشہ سے اسے جلادیا (۶)۔ حضرت عمر (رض) نے بھی تدوین حدیث کا ارادہ کیا، لیکن اسی اندیشہ سے کہ کہیں قرآن و حدیث کے درمیان التباس نہ ہوجائے ترک کردیا، چنانچہ فرماتے ہیں۔

جیسا کہ تمکو معلوم ہے کہ میں نے حدیثوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ افضل کتاب میں سے بہت سے لوگوں نے کتاب اللہ کے ساتھ بعض چیزیں لکھیں اور پھر اسی میں معروف ہوگئے۔ اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ یہ معاملہ کبھی نہیں کروں گا، اسلئے میں تدوین حدیث کا کام چھوڑ دے رہا ہوں۔

اسطرح عرصہ تک صحابہ کی بڑی تعداد احادیث کے لکھنے کو ناپسند کرتی رہی، جسکی وجہ سے تدوین حدیث کا کام پہلی صدی کے بجائے دوسری صدی ھجری میں شروع ہوا۔

ان الصحابہ انما کرھوا الکتابہ لان من کان قبلکم اتخذ واالکتب، فاعجبوا بھا، فکانوا یکرھون ان یشتغلوا بھا عن القرآن (۸)

صحابہ احادیث کے لکھنے کو ناپسند کرتے تھے، اسلئے کہ پہلے لوگوں نے بعض چیزیں لکھیں اور اس سے متاثر ہو کر اسی میں مگن ہو گئے، اسلئے وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ وہ قرآن کے علاوہ کسی اور چیز میں مصروف ہو جائیں۔

لیکن احادیث کے قلمبند نہ کئے جانے کا یہ معاملہ ایک عمومی معاملہ تھا، خود رسول اللہ نے بھی جو کتابت حدیث سے منع فرمایا تھا وہ بھی ایک عمومی حکم تھا، چنانچہ آپ نے اس وقت بھی بعض صحابہ کو اس حکم سے مستثنی کر دیا تھا اور انہیں اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ حدیثوں کو لکھ لیا کریں، جیسا کہ عبداللہ بن عمر بن العاص اور پھر کچھ دنوں کے بعد جبکہ احادیث اور قرآن کے درمیان التباس کا اتنا زیادہ اندیشہ نہ رہا تو آپ نے احادیث کے لکھ لینے کی باضابطہ اجازت دے دی جیسا کہ فرمایا۔

قید واالعلم بالکتاب (۹) علم کو دائرہ تحریر میں لاو۔

فتح مکہ کے موقع سے آپ نے خطبہ دیا، خطبہ کے بعد یمن کا ایک شخص ابو شاہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا میرے لئے آپ یہ لکھ دیں، اس پر آپ نے فرمایا۔

اکتبولابی شاہ (۱۰) ابو شاہ کے لئے لکھ دو

قد جاء عبداللہ یستفتی رسول اللہ فی شان کتابۃ قائلا، اکتب کل ما اسمع ؟ قال نعم، قال، فی العرض والغضب ؟، قال نعم فانی لااقول فی ذلک الاحقاً (۱۱)

حضرت عبداللہ نے رسول اللہ سے پوچھا میں آپ سے جو کچھ بھی سنوں، لکھ لوں ؟ آپ نے فرمایا ہاں انہوں نے عرض کیا غصہ اور عام حالات میں بھی ؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اسلئے کہ میں کبھی بھی حق کے علاوہ کچھ نہیں کہتا ہوں۔

حضرت ابو ھریرہ فرماتے ہیں کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ حدیثیں کسی کو محفوظ نہیں، البتہ عبداللہ بن عمر مستثنی ہیں، کیونکہ وہ آنحضرت کی احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا (۱۲) اسطرح انفرادی طور پر احادیث کے لکھنے کا کام آنحضرت کی زندگی میں ہی آپ کی اجازت سے شروع ہو چکا تھا، چنانچہ احادیث کے بہت سے مجموعے آپ کی زندگی میں قلمبند کئے گئے ان میں قابل ذکر مجموعے یہ ہیں۔

صحیفہ سعد بن عبادہ الانصاری، صحیفہ صادقہ جسے عبداللہ بن عمر بن عاص نے مرتب کیا تھا، صحیفہ عبداللہ بن عباس، صحیفہ ھمام جسے حضرت ابو ھریرہ (رض) نے مرتب کیا تھا، اسی طرح سمرہ بن جندب نے بھی احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ (۱۳)۔

ان مجموعہ احادیث کے علاوہ بعض تحریری احکام، معاہدات اور فرامین جو آنحضرت نے قبائل کے نام بھیجے، اور اسی طرح وہ خطوط جو آپنے اپنے عہد کے حکمران اور امراء کے نام ارسال

کئے، احادیث کے اس تحریری ذخیرہ کے تحت آتے ہیں جو آپ کی زندگی میں لکھا گیا۔

احادیث کا یہ تحریری سرمایہ جو رسول اللہ کی زندگی میں قلمبند کیا گیا، علماء حدیث نے ان تمام کی مکمل تحقیق اور چھان بین کی اور صرف اسی وجہ سے اسے قابل اعتماد نہ سمجھا کہ اس پر عہد نبوی میں لکھے جانے کی لیبل چسپاں ہے، چنانچہ انہوں نے ایسے کئی مجموعوں کو غیر معتبر قرار دے دیا جو انکے معیار اور تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہ اترا جیسے "ابن ھدیہ دینار اور ابوالدنیا الاشج کے نسخے"۔(۱۴)۔ اسلئے یہ کہنا کہ احادیث دوسری صدی ھجری میں ہی لکھی گئی اور اس سے پہلے اسکا کوئی تحریری وجود نہیں تھا، صحیح نہیں ہے۔

وضع حدیث

کبار صحابہ کے عہد تک احادیث کا ذخیرہ بالکل خالص اور ہر طرح کی آمیزش سے پاک تھا

ان انسا حدث بحدیث فقال لہ رجل اسمعت ھذا من رسول اللہ؟ قال نعم او حدثنی من لم یکذب، واللہ ماکنا نکذب ولا کنا ندری ما الکذب (۱۵)

لوگ ایک دوسرے سے حدیث بیان کرتے تو ان سے پوچھا جاتا کیا آپ نے یہ رسول اللہ سے سنا ہے، وہ کہتے ہاں یا اس شخص نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی جو جھوٹ نہیں بولا، خدا کی قسم ہم نہ جھوٹ بولتے تھے اور نہ جانتے تھے کہ جھوٹ کیا ہے

وضع حدیث کا فتنہ تقریبا چالیس ھجری سے شروع ہوا جبکہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے اور پھر یہ خلیج بڑھتی چلی گئی، اس موقع سے عبداللہ بن سبا اور اسکے گروہ نے بھی اہم رول ادا کیا اور حدیثیں گھڑی جانے لگیں، ابتداء میں لوگوں کے فضائل میں حدیثیں گھڑی گئیں جسکا آغاز شیعوں کی جانب سے ہوا اور پھر وضع حدیث کا سلسلہ چل پڑا اور بے شمار حدیثیں گھڑی گئیں، اس میں جہاں اعداء اسلام نے بھرپور حصہ لیا تدوین حدیث کا کام جب باضابطہ طور پر شروع ہوا تو اس موقع سے علماء حدیث کے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں پھیلی ہوئی نقلی اور جعلی روائیتوں کے درمیان سے صحیح احادیث کو کس طرح الگ کیا جائے، چنانچہ اسکے لئے انہوں نے دو مستقل اصول مرتب کئے۔ درایت اور سند۔

درایت

اصول درایت کے تحت متن حدیث کا جائز لیا جاتا ہے، اسطرح کہ اسکے الفاظ کس نوعیت کے ہیں۔ معنی کیسے ہیں جو بات کہی جارہی ہے وہ معقول بھی ہے یا نہیں، چنانچہ وہ حدیث جو اصول درایت پر پوری نہ اترے علماء حدیث کے یہاں موضوع اور جالی قرار پائیگی چاہے وہ سند

مستشرقین اور علم حدیث

مولانا حسنین احمد ندوی

مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جن علوم وفنون پر بہت زیادہ لکھا ہے اور اسے خاص طور سے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے، ان میں سرفہرست علم حدیث ہے، علم حدیث پر لکھنے والے مشہور مستشرقین یہ ہیں، اے آر گب A R GIBB، گولڈ زیہر GOLDZIHER، مارگولیوتھ MORGOLIOUTH، لیمنس LAMMENS، جوزف شاخت J SHACHT، ڈوزی DOZY، اسپرنگر SPRENGER، ولنسک WENSINCK، بروکلمان BROCKELMANN، نولوبکی NOLDKETHESDAR، ولیم میور WILLIAM MUIR، فواد مزگیں، ایچ رتر H RITTER۔

ان مستشرقین نے احادیث پر مختلف قسم کے اعتراض کئے ہیں، جنکا ماحصل یہ ہے،

(۱) تدوین حدیث کا کام چونکہ سو سال بعد یعنی دوسری صدی ھجری میں شروع ہوا، اس سے مسلمانوں کو احادیث کی ذخیرہ میں کمی بیشی کرنے اور اسے اپنے اغراض کے مطابق گھڑ لینے کا موقع ملا، یہی وجہ ہے کہ احادیث چاہے صحیح ترین کتب میں پائی جاتی ہوں اور انکی صحت علماء اسلام کے نزدیک کتنی ہی ثابت شدہ کیوں نہ ہو، قلیل ترین تعداد کے علاوہ سب کی سب موضوع اور جالی ہیں۔

(۲) احادیث کے ذخیرہ کو موضوع اور نقلی حدیثوں سے پاک کرنے کے لئے علماء نے جو کوششیں کیں وہ کامیاب ثابت نہ ہو سکیں، اسلئے کہ انہوں نے متن حدیث پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

(۳) احادیث کی اسناد انتہائی لاپروائی سے مرتب کردی گئی ہیں، اسطرح کہ قدیم مستند شخصیت کے منھ میں اپنا پسندیدہ نظریہ وخیال ڈال کر اسے کسی بھی سند میں شامل کردیا گیا ہے۔

مستشرقین نے احادیث سے متعلق جو سوالات اٹھائے ہیں واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام تر انکے جہل اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے یا پھر وہ اسکے ذریعہ عام لوگوں کے ذہنوں کی حدیث سے متعلق پراگندہ کرنے کی کوشش کی ہے، جو عربی سے ناواقفیت یا کسی اور وجہ سے اس فن سے واقف نہیں ہیں، اب ہم تفصیل سے مذکورہ تینوں سوالوں کا جائزہ لیں گے جسکی روشنی میں آپ خود یہ فیصلہ کرسکیں گے کہ یہ سوالات کس حد تک بے معنی ہیں۔

تدوینِ حدیث

یہ ایک حقیقت ہے کہ احادیث کی ترتیب وتدوین کا کام باضابطہ[۱] طور پر ۱۰۱ھ سے شروع ہوا جبکہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے دور خلافت میں تمام گورنروں کو یہ ہدایت بھیجی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو تحریری طور پر جمع کرائیں تاکہ یہ علم کہیں صاحب علم[۱] کے ساتھ

رخصت نہ ہوجائے، چنانچہ آپ نے مدینہ کے گورنر کو یہ ہدایت بھیجی

انظر ماکان من حدیث رسول اللہ فاکتبہ فانی خفت دروس العلم و ذھاب اھلہ (۱)

رسول اللہ (ص) کی جو حدیثیں بھی ملیں انھیں لکھ لو، مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اہل علم کے ساتھ ساتھ یہ علم بھی اس دنیا سے رخصت نہ ہو جائے۔

عن سعید بن ابراھیم قال امرنا عمر بن عبدالعزیز بجمع السنن فکتبناھا دفترا دفترا، فبعث الی کل ارض لہ علیھا سلطان دفترا (۲)

سعید بن ابراھیم بیان کرتے ہے کہ ہمیں رسول اللہ (ص) نے احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا، چنانچہ ہم نے دفتر کے دفتر مرتب کئے اور پھر اسے سارے ملک میں بھیج دیا۔

تدوین حدیث کا کام باضابطہ طور عہد رسول میں شروع نہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس وقت قرآن کا نزول ہورہا تھا اور تمام تر توجہ اس کے لکھنے اور محفوظ کرنے پر لگی ہوئی تھی، دوسرے اس وقت اگر احادیث کے لکھنے کا بھی اہتمام کیا جاتا تو اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ کوئی حدیث قرآن کے ساتھ مل جائے، اس وجہ سے ابتداء میں خود رسول اللہ نے احادیث کے لکھنے سے منع فرمادیا، البتہ اسے زبانی بیان کرنے کی اجازت دی، چنانچہ آپ نے فرمایا

لاتکتبو عنی و من کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ ، وحد ثو عنی ولا حرج (۳)

میری باتیں مت لکھو، جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا اسے چاہئے کہ اسے مٹادے، البتہ میری باتیں بیان کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اسطرح وقتی مصلحت کے پیش نظر آپ نے احادیث کے لکھنے سے منع فرمادیا لیکن اسے یاد رکھنے اور دوسروں تک پہنچانے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ لوگوں کو اس پر ابھارا۔

نضر اللہ امرا سمع مقالتی فحفظھا ووعاھا ، فاداھا کما سمع ، فرب مبلغ اوعی من سامع (۴)
الا لیبلغ الشاھد منکم الغائب (۵)

اللہ تعالی نے اس شخص کو سر سبز و شاداب رکھے جس نے میری بات سنی، اسے یاد کیا اور سمجھا، پھر اسے ویسے ہی دوسرے تک پہنچایا ہو سکتا ہے کہ سننے والے سے زیادہ ہوشیار وہ شخص ہو جس تک میری بات پہنچی۔

تم میں کا ہر موجود اس شخص تک میری بات پہنچادے، جو یہاں نہیں ہے

جمع قرآن کا خاص اہتمام اور اس سلسلہ میں غیر معمولی احتیاط کہ کہیں حدیث کا کوئی ٹکڑا قرآن کے ساتھ نہ مل جائے، عہد نبوی کے بعد بھی کچھ دنوں تک باقی رہا، چنانچہ حضرت ابوبکر (رض) نے کچھ احادیث ایک جگہ جمع کیں اور پھر اسی اندیشہ سے اسے جلادیا (۶)۔ حضرت عمر (رض) نے بھی تدوین حدیث کا ارادہ کیا، لیکن اسی اندیشہ سے کہ کہیں قرآن و حدیث کے درمیان التباس نہ ہوجائے ترک کردیا، چنانچہ فرماتے ہیں۔

جیسا کہ تمکو معلوم ہے کہ میں نے حدیثوں کے مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ افضل کتاب میں سے بہت سے لوگوں نے کتاب اللہ کے ساتھ بعض چیزیں لکھیں اور پھر اسی میں معروف ہو گئے۔ اور کتاب اللہ کو چھوڑ دیا۔ خدا کی قسم میں کتاب اللہ کے ساتھ یہ معاملہ کبھی نہیں کروں گا، اسلئے میں تدوین حدیث کا کام چھوڑ دے رہا ہوں۔

اسطرح عرصہ تک صحابہ کی بڑی تعداد احادیث کے لکھنے کو ناپسند کرتی رہی، جسکی وجہ سے تدوین حدیث کا کام پہلی صدی کے بجائے دوسری صدی ھجری میں شروع ہوا۔

ان الصحابہ انما کرھوا الکتابہ لان من کان قبلکم اتخذوا الکتب، فاعجبوا بھا، فکانوا یکرھون ان یشتغلوا بھا عن القرآن (۸)

صحابہ احادیث کے لکھنے کو ناپسند کرتے تھے، اسلئے کہ پہلے لوگوں نے بعض چیزیں لکھیں اور اس سے متاثر ہو کر اسی میں مگن ہو گئے، اسلئے وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ وہ قرآن کے علاوہ کسی اور چیز میں مصروف ہو جائیں۔

لیکن احادیث کے قلمبند نہ کئے جانے کا یہ معاملہ ایک عمومی معاملہ تھا، خود رسول اللہ نے بھی جو کتابت حدیث سے منع فرمایا تھا وہ بھی ایک عمومی حکم تھا، چنانچہ آپ نے اس وقت بھی بعض صحابہ کو اس حکم سے مستثنی کر دیا تھا اور انہیں اس بات کی اجازت دی تھی کہ وہ حدیثوں کو لکھ لیا کریں، جیسا کہ عبداللہ بن عمر بن العاص اور پھر کچھ دنوں کے بعد جبکہ احادیث اور قرآن کے درمیان التباس کا اتنا زیادہ اندیشہ نہ رہا تو آپ نے احادیث کے لکھ لینے کی باضابطہ اجازت دے دی جیسا کہ فرمایا۔

قیدوا العلم بالکتاب (۹) علم کو دائرہ تحریر میں لاو۔

فتح مکہ کے موقع سے آپ نے خطبہ دیا، خطبہ کے بعد یمن کا ایک شخص ابو شاہ کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا میرے لئے آپ یہ لکھ دیں، اس پر آپ نے فرمایا۔

اکتبوا لابی شاہ (۱۰) ابو شاہ کے لئے لکھ دو

قد جاء عبداللہ یستفتی رسول اللہ فی شان کتابتہ قائلا، اکتب کل ما اسمع؟ قال نعم، قال، فی العرض والغضب؟، قال نعم فانی لا اقول فی ذلک الا حقاً (۱۱)

حضرت عبداللہ نے رسول اللہ سے پوچھا میں آپ سے جو کچھ بھی سنوں، لکھ لوں؟ آپ نے فرمایا ہاں انہوں نے عرض کیا غصہ اور عام حالات میں بھی؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ اسلئے کہ میں کبھی بھی حق کے علاوہ کچھ نہیں کہتا ہوں۔

حضرت ابو ھریرہ فرماتے ہیں کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ حدیثیں کسی کو محفوظ نہیں، البتہ عبداللہ بن عمر مستثنی ہیں، کیونکہ وہ آنحضرت کی احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا (۱۲) اسطرح انفرادی طور پر احادیث کے لکھنے کا کام آنحضرت کی زندگی میں ہی آپ کی اجازت سے شروع ہو چکا تھا، چنانچہ احادیث کے بہت سے مجموعے آپ کی زندگی میں قلمبند کئے گئے ان میں قابل ذکر مجموعے یہ ہیں۔

صحیفہ سعد بن عبادہ الانصاری، صحیفہ صادقہ جسے عبداللہ بن عمر بن عاص نے مرتب کیا تھا، صحیفہ عبداللہ بن عباس، صحیفہ ھمام جسے حضرت ابو ھریرہ (رض) نے مرتب کیا تھا، اسی طرح سمرہ بن جندب نے بھی احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا۔ (۱۳)۔

ان مجموعہ احادیث کے علاوہ بعض تحریری احکام، معاہدات اور فرامین جو آنحضرت نے قبائل کے نام بھیجے، اور اسی طرح وہ خطوط جو آپنے اپنے عہد کے حکمران اور امراء کے نام ارسال

کئے، احادیث کے اس تحریری ذخیرہ کے تحت آتے ہیں جو آپ کی زندگی میں لکھا گیا۔
احادیث کا یہ تحریری سرمایہ جو رسول اللہ کی زندگی میں قلمبند کیا گیا، علماء حدیث نے ان تمام کی مکمل تحقیق اور چھان بین کی اور صرف اسی وجہ سے اسے قابل اعتماد نہ سمجھا کہ اس پر عہد نبوی میں لکھے جانے کی لیبل چسپاں ہے، چنانچہ انہوں نے ایسے کئی مجموعوں کو غیر معتبر قرار دے دیا جو انکے معیار اور تحقیق کی کسوٹی پر پورا نہ اترا جیسے "ابن ھدبہ دینار اور ابوالدنیا الاشیخ کے نسخے"۔(۱۴) ۔اسلئے یہ کہنا کہ احادیث دوسری صدی ھجری میں ہی لکھی گئی اور اس سے پہلے اسکا کوئی تحریری وجود نہیں تھا، صحیح نہیں ہے۔

وضع حدیث

کبار صحابہ کے عہد تک احادیث کا ذخیرہ بالکل خالص اور ہر طرح کی آمیزش سے پاک تھا

ان انسا حدث بحدیث فقال لہ رجل اسمعت ھذا من رسول اللہ؟ قال نعم او حدثنی من لم یکذب، واللہ ماکنا نکذب ولاکنا ندری مالکذب (۱۵)

لوگ ایک دوسرے سے حدیث بیان کرتے تو ان سے پوچھا جاتا کیا آپ نے یہ رسول اللہ سے سنا ہے، وہ کہتے ہاں یا اس شخص نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی جو جھوٹ نہیں بولا، خدا کی قسم ہم نہ جھوٹ بولتے تھے اور نہ جانتے تھے کہ جھوٹ کیا ہے

وضع حدیث کا فتنہ تقریبا چالیس ھجری سے شروع ہوا جبکہ حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے اور پھر یہ خلیج بڑھتی چلی گئی، اس موقع سے عبداللہ بن سبا اور اسکے گروہ نے بھی اہم رول ادا کیا اور حدیثیں گھڑی جانے لگیں، ابتداء میں لوگوں کے فضائل میں حدیثیں گھڑی گئیں جسکا آغاز شیعوں کی جانب سے ہوا اور پھر وضع حدیث کا سلسلہ چل پڑا اور بے شمار حدیثیں گھڑی گئیں، اس میں جہاں اعداء اسلام نے بھرپور حصہ لیا تدوین حدیث کا کام جب باضابطہ طور پر شروع ہوا تو اس موقع سے علماء حدیث کے سامنے ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہزاروں کی تعداد میں پھیلی ہوئی نقلی اور جعلی روائیتوں کے درمیان سے صحیح احادیث کو کس طرح الگ کیا جائے، چنانچہ اسکے لئے انہوں نے دو مستقل اصول مرتب کئے۔ درایت اور سند۔

درایت

اصول درایت کے تحت متن حدیث کا جائز لیا جاتا ہے، اسطرح کہ اسکے الفاظ کس نوعیت کے ہیں۔ معنی کیسے ہیں جو بات کہی جارہی ہے وہ معقول بھی ہے یا نہیں، چنانچہ وہ حدیث جو اصول درایت پر پوری نہ اترے علماء حدیث کے یہاں موضوع اور جالی قرار پائیگی چاہے وہ سند

کے اعتبار سے کتنی ہی عمدہ اور اعلیٰ کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حافظ ابن قیم نے زادالمعاد میں یہ حدیث " جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن رہا اور وفات پائی وہ شہید ہوا۔ نقل کرنے کے بعد عقلی دلائل سے اسے رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لوکان اسناد هذا الحدیث کالشمس کان غلطا ووهما (۱۶)

اگر اس حدیث کی سند سورج کی طرح روشن ہو جب بھی یہ حدیث غلط اور موضوع قرار دی جائے گی

اصول درایت کے تحت حدیث میں کن کن باتوں پر غور کیا جائے گا، محدثین نے اسکے اصول مقرر کر دئے ہیں، جسے فتح المغیث نے ابن جوزی سے نقل کیا ہے، سید علی قاری نے اسے الموضوعات الکبیر میں تقریبا ۲۲ صفحوں میں مثالوں کے ساتھ لکھا ہے، اسکا خلاصہ علامہ شبلی نے سیرت النبی کے مقدمہ میں درج کیا ہے اور اسے ہی معمولی سی تبدیلی کے ساتھ مصطفیٰ السباعی نے اپنی کتاب السنته ومکانتها فی التشریع الاسلامی میں درج کیا ہے، متن حدیث میں جن چیزوں کو وضع کی علامت قرار دیا گیا ہے، ان میں اہم یہ ہیں۔

رکیک الفاظ

اس طرح کہ عربی زبان و ادب کا ذوق رکھنے والا یہ محسوس کرے کہ ایک فصیح و بلیغ شخص کے زبان سے اس قسم کے الفاظ نہیں نکل سکتے چہ جائیکہ رسول اللہ کی زبان سے جو کہ افصح العرب ہیں،

معنیٰ کا فساد

وہ حدیث جو عقل کے خلاف ہو اور اسکی کوئی تاویل ممکن نہ ہو، جیسے نوح (ع) کی کشتی نے سات مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پاس دو رکعت نماز ادا کی۔

ایسی حدیث جو عام اخلاقی ضابطوں کے خلاف ہو۔ جیسے خوبصورت چہروں کو دیکھنے سے آنکھ کی روشنی بڑھتی ہے "۔ وہ حدیث جو مشاہدات و محسوسات کے خلاف ہو جیسے " سو سال بعد کوئی ایسا بچہ پیدا نہ ہوگا جس سے اللہ کو دلچسپی ہو "۔ وہ حدیث جو طب کے مسلمہ اصول کے خلاف ہو جیسے " باذنجان ہر مرض کے لئے شفا ہے "۔

وہ حدیث جو تاریخی حقائق کے مغائر یا انسان اور کائنات سے متعلق اللہ کی سنت کے خلاف ہو جیسے " عوج بن عنق کی لمبائی ۳۰۰ گز تھی۔ طوفان نوح میں پانی صرف اسکے گھٹنے تک پہنچ سکا ۔ اسکی لمبائی کا یہ حال تھا کہ وہ سمندر میں ہاتھ ڈال کر اسکی تہہ سے مچھلی پکڑتا اور پھر سورج سے قریب کر کے بھون لیتا تھا۔ اسی طرح وہ حدیث جس میں " بابا رتن ہندی کا ذکر آتا ہے کہ انکی عمر چھ سو سال تھی اور وہ رسول اللہ سے ملے تھے "۔ اسی طرح یہ حدیث کہ " رسول اللہ کا سر حضرت علی (رض) کی گود میں تھا۔ اور آپ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ اس درمیان سورج غروب ہو گیا۔ جب وحی کا سلسلہ ختم ہوا تو آپ نے حضرت علی سے دریافت فرمایا۔ اے علی تم نے عصر کی نماز پڑھی یا نہیں۔ انہوں نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ آپ نے فرمایا اے اللہ تو اس حقیقت سے بخوبی

واقف ہے کہ علی تیرے اور تیرے رسول کے کاموں میں مصروف رہے۔ تو انکے لئے سورج کو لوٹا دے۔ چنانچہ سورج واپس آیا۔ حضرت علی نے نماز عصر ادا کی اور پھر سورج غروب ہو گیا۔
وہ حدیث جو قرآن کے نص صریح کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہ ہو جیسے "ولد زنا اور اسکی سات پشت جنت میں نہیں جائے گی۔ یہ حدیث لاتزر وازرہ وزر اخری (کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) کے خلاف ہے۔
وہ حدیث جو سنت متواترہ کے خلاف ہو جیسے "جب تم سے کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو حق کے مطابق ہو تو اسکو لے لو۔ چاہے میں نے بیان کیا ہو یا نہ کیا ہو۔" یہ حدیث ایک حدیث متواتر کے خلاف ہے جسمیں یہ کہا گیا ہے "جو شخص جان بوجھ کر میرے بارے میں جھوٹ بولے اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے"۔
وہ حدیث جو قرآن و حدیث سے ماخوذ عام اصولوں کے خلاف ہو جیسے "جس شخص کو کوئی لڑکا پیدا ہو اور اس نے اسکا نام محمد رکھا تو وہ اور اسکا لڑکا دونوں جنت میں ہوں گے"۔ یہ حدیث قرآن و سنت کے بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اسلئے کہ نجات کا دارومدار اچھے اعمال پر ہے نہ کہ نام یا لقب پر۔
وہ حدیث جو مشہور تاریخی حقائق کے خلاف ہو جیسے "رسول اللہ نے خیبر کے یہودیوں کا جزیہ معاف کر دیا تھا۔ اس حدیث میں سعد بن معاذ کی گواہی کا ذکر ہے۔ حالانکہ وہ غزوہ خندق میں وفات پا چکے تھے۔ اسی طرح دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے جبکہ معاویہ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے۔ اسکے علاوہ اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا۔ جزیہ کا حکم غزوہ تبوک کے بعد آیا۔
روایت میں کوئی ایسا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر واقع ہوتا تو سینکڑوں آدمی اسکو روایت کرتے۔ لیکن اسکے باوجود صرف ایک ہی راوی نے اسے روایت کیا ہو جیسے حدیث غدیر خم۔
وہ حدیث جس میں معمولی کام پر بڑے انعام کا وعدہ ہو جیسے "جو شخص لاالہ الااللہ کہے گا اللہ تعالی اسکے لئے ایک پرندہ پیدا کرے گا۔ جسکی ستر ہزار زبانیں ہوں گی۔ ہر زبان سے وہ ستر ہزار لغت میں اس شخص کے لئے استغفار کرے گا۔

اسناد

حضرات صحابہ ایک دوسرے سے احادیث بیان کیا کرتے تھے۔ تابعین صحابہ سے حدیثیں سنا کرتے تھے لیکن کوئی کسی سے یہ مطالبہ نہیں کرتا تھا کہ وہ اس بات پر شہادت پیش کرے کہ وہ جو حدیث سنا رہا ہے وہ واقعی فرمان رسول ہے۔ یہ اسلئے کہ اس وقت تک وہ اس بات کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے کہ رسول اللہ سے متعلق کوئی شخص جھوٹ بولنے کی جراءت کرے گا۔
لیکن جب عبداللہ بن سبا کا فتنہ شروع ہوا اور احادیث گھڑی جانے لگیں تو صحابہ اور تابعین نے احادیث کو اس کے بیان کرنے والوں کے حالات جانے بغیر قبول کرنا چھوڑ دیا، چنانچہ ابن سیرین سے منقول ہے۔
صحابہ اسناد کے بارے میں نہیں پوچھا کرتے تھے لیکن جب جب فتنہ کا دور شروع ہوا تو وہ حدیث سنتے ہی کہتے کہ ان افراد کے نام بتاؤ جنہوں نے حدیث بیان کی، پھر وہ ان میں غور کرتے اگر لوگ صحیح رہے تو حدیث قبول کرتے اور اگر غلط ہوتے تو رد کر دیتے۔
ابن مبارک کہا کرتے تھے، اسناد دین کا ایک جز بن چکا ہے، اسلئے کہ اگر اسناد نہ ہو تو جس کے جی میں جو آئے کہہ دے۔

اسکے علاوہ صحابہ اور تابعین نے ہر ایرے غیرے سے حدیث سننے کے بجائے ثقہ اور بااعتماد راویوں سے حدیث سننے کا اہتمام کیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایک حدیث سننے کے لئے ہزاروں کیلومیٹر کا سفر کیا اور معتبر لوگوں سے احادیث حاصل کیں۔ جیسا کہ سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں۔

انی کنت لا سیر اللیالی والایام فی طلب الحدیث والواحد۔(۱۹)

ایک حدیث سننے کے لئے ہم رات رات اور دن دن بھر کا سفر کیا کرتے تھے۔

بشر بن عبداللہ الحضرمی کہتے ہیں۔

ان کنت لارکب الی المصر من الامصار فی طلب الحدیث الواحد لاسمعہ

اگر کسی بھی شہر کے متعلق ہمیں یہ امید ہوتی کہ وہاں صحیح حدیث سننے کو ملے گی تو ہم وہاں جاتے

اسطرح احادیث کے ساتھ سندوں کا سلسلہ شروع ہوا اور علماء نے ہر ہر راوی کے حالات، اسکے کردار اور نجی و خارجی زندگی سے متعلق تفصیلی حالات قلمبند کئے، اس سلسلہ میں انہوں نے کسی کی وجاہت عرفی۔ تقوی اور بزرگی کی پرواہ کئے بغیر ہر ایک کی جاسوسی کی اور جسکی زندگی میں کہیں جھول پایا۔ اسکی روایت رد کردی۔ یحی بن سعید سے کہا گیا۔

(۲۰) اما تخشی ان یکون ھولاالذین ترکت حدیثم خصمالک عند اللہ یوم القیامتہ؟ نقال۔ لان یکون ھولا خصمی احب الی من ان یکون خصمی رسول اللہ یقول۔ لم لم تذب الکذب عن حدیثی (۲۱)

کیا تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ جن لوگوں کی حدیث تم نے رد کردی ہیں وہ روز حشر تمہارے خلاف پیش ہوں گے، انہوں نے کہا کہ ان لوگوں کا میرے خلاف پیش ہونا مجھے اس بات سے زیادہ پسند کہ رسول اللہ میرے فریق ہیں اور کہیں کہ تم نے میری حدیثوں سے جھوٹ کو کیوں نہیں دور کیا۔

اسطرح فن رجال کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آیا اور اس موضوع پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں۔ آج احادیث کی کتابوں میں کوئی ایسا نام نہیں ہے جسکے تفصیلی حالات فن رجال کی کتابوں میں نہ مل جائیں کہ وہ کون تھا۔؟ کیا مشغلہ تھا۔ کیریکٹر کیسا تھا۔ حافظہ کیسا تھا۔؟ کسی بات کو سمجھنے کی اس میں کتنی صلاحیت تھی۔ وہ عالم تھا یا جاہل۔؟ قابل اعتبار تھا یا ناقابل اعتبار۔؟ وغیرہ وغیرہ۔

اسکے علاوہ علماء حدیث نے اسناد کے جانچ پڑتال کے لئے مستقل اصول بنایا تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ کونسی سند صحیح اور اصلی ہے اور کونسی سند غلط ہے اور جالی ہے، چنانچہ بہت سی چیزوں کو سند میں وضع کی علامت قرار دیا گیا، جن میں اہم یہ ہیں۔

روایت کرنے والا خود تو ثقہ ہو لیکن وہ کسی ایسے شخص سے روایت کرے جسکے بارے میں یہ بات مشہور ہو کہ وہ جھوٹ بولتا تھا اور اس جھوٹ کی وجہ سے کسی دوسرے ثقہ راوی نے اسکی روایت نہ کی ہو۔

راوی خود اس بات کا اعتراف کرے کہ اس نے روایتیں گھڑی ہیں، جیسا کہ ابو عصمہ نوح بن ابی مریم نے اعتراف کرلیا تھا کہ اس نے قرآن کی سورتوں کے فضائل سے متعلق احادیث گھڑی ہیں، اسی طرح عبدالکریم بن ابی عوجاء نے اعتراف کیا تھا کہ اس نے حلال و حرام سے متعلق تقریباً چار ہزار روایتیں گھڑی ہیں، لہذا اس قسم کے راوی جس سند میں بھی آئیں گے وہ جالی قرار پائے گی، راوی کسی ایسے شخص سے روایت بیان کرے جس سے اسکی ملاقات تاریخی طور پر ثابت نہ ہو، یا روایت بیان کرنے والے کی پیدائش ہی اس شخص کے بعد ہو جس سے کہ وہ روایت بیان کر رہا ہے، یا وہ اس جگہ گیا ہی نہ ہو جہاں کے بارے میں وہ یہ بیان کرے کہ اس نے وہاں یہ روایت سنی ہے، جیسا کہ مامون بن احمد نے ایک روایت بیان کرتے ہوئے کہ اس نے ھشام بن عمار سے یہ روایت سنی ہے، اس پر حافظ ابن حبان نے ان سے پوچھا کہ تم ملک شام کب گئے تھے۔؟ انہوں نے جواب دیا ۲۵۰ھ میں اس پر ابن حبان نے کہا کہ وہ ھشام جن سے تم روایت بیان کر رہے ہو ۲۴۰ھ میں انکا انتقال ہوچکا، اسی طرح عبداللہ بن اسحاق کرمانی نے محمد بن یعقوب سے کوئی روایت بیان کی، اس پر ان سے کہا گیا کہ آپ جن سے یہ روایت بیان کر رہے ہیں، آپ کی پیدائش سے نو سال قبل وہ وفات پاچکے تھے محمد بن ھاشم الکشی نے عبد بن حمید سے کوئی روایت بیان کی تو اس پر حاکم ابو عبداللہ نے کہا کہ جناب والا نے عبد بن حاکم کے مرنے کے تیس سال بعد ان سے یہ روایت سنی، معلی بن عرفان نے کہا کہ مجھ سے ابووائل نے یہ حدیث بیان کی کہ حضرت ابن مسعود (رض) جنگ حنین کے موقع سے، ہمارے پاس آئے، اس پر ابو نعیم نے کہا کہ تم کہیں آواگوں پر تو یقین نہیں رکھتے، اسلئے کہ ابن مسعود حضرت عثمان کی خلافت سے تین سال قبل وفات پاچکے تھے۔

علماء حدیث نے روایت سے متعلق جہاں تفصیل سے حالات قلمبند کئے ہیں، وہیں انہوں نے خاص طور سے انکی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات، جہاں جہاں انہوں نے قیام کیا، جہاں جہاں کا سفر کیا اور انکے اساتذہ اور شاگردوں کا ذکر خاص طور سے کیا ہے، جسکے ذریعہ اسناد میں کسی بھی قسم کے جھول کو فوراً محسوس کیا جاسکتا ہے، چنانچہ سفیان ثوری کہا کرتے تھے، جب راوی جھوٹ بولنے لگے تو ہم نے تاریخ سے بھی کام لینا شروع کر دیا۔

اسکے علاوہ خود راوی کے حالات کو بھی علماء نے روایت اور اسکی اسناد کے صحیح یا غلط ہونے کے فیصلے میں پیش نظر رکھا ہے، چنانچہ علماء حدیث نے "الھریسۃ تشد الظھر۔ ھریس پیٹھ کو مضبوط کرتا ہے، کو اس وجہ سے رد کر دیا کہ جس نے یہ حدیث بیان کی خود اسکی ھریس کی دکان تھی۔

علماء حدیث نے احادیث کے ذخیرہ کو ہر طرح کی آمیزش سے پاک کرنے کے لئے جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ انسانی تاریخ میں اسکی کوئی نظیر نہیں ملتی، انکی کوششوں نے اس بات کو نہ صرف ممکن بلکہ یقینی بنا دیا ہے کہ اگر موضوع روایتوں کی تعداد ہزاروں ہی نہیں بلکہ کروڑوں تک بھی پہنچ جائے جب بھی انہیں صحیح احادیث سے اسی طرح باسانی الگ کیا جاسکتا ہے جس طرح دودھ میں گری ہوئی مکھی کو دودھ سے، علماء نے اسکے لئے جہاں متن حدیث اور سند حدیث کے جانچ پڑتال کے مستقل اصول وضع کئے وہیں انہوں نے نقلی اور موضوع روایتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی، تاکہ ایک عام آدمی بھی نقلی اور جالی روایتوں

سے دھوکہ نہ کھائے، چنانچہ ایسی بہت سی کتابیں ترتیب دی گئیں جس میں صرف جعلی اور موضوع روایتوں کو جمع کیا گیا جن میں مشہور کتابیں یہ ہیں۔

۱۔الموضوعات علامہ جوزی ۵۹۸ھ
(۲) المغنی عن الحفظ والکتاب ابو حفص عمر بن بدر ۶۸۰ھ
(۳) الدرر الملتقط علامہ صغانی ۶۵۰ھ
(۴) تذکرہ الموضوعات ابن طاہر المقدسی ۵۰۷ھ
(۵) اللآلئی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ علامہ سیوطی
(۶) تذکرہ الموضوعات محمد بن طاہر ۹۸۶ھ
(۷) الموضوعات الکبیر ملا علی قاری ۱۰۱۴ھ
(۸) الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ علامہ شوکان ۱۲۵۰ھ
(۹) رسالہ امام صنعانی
(۱۰) الوء لوء المرصوص فیما لا اصل لہ شیخ محمد بن ابو المحاسن ۱۳۰۵ھ

حواشی وحوالہ جات

(۱) طبقات بن سعد ۲\۱۳۴۔ (۲) جامع بیان العلم ۳۶
(۳) صحیح مسلم عن ابی سعید الخدری (۴،۵) جامع بیان العلم ۴۱
(۶) تذکرہ الحفاظ ۱\۵۔ (۷) کنز العمال ۵\۲۳۹
(۸) تقیید العلم ۵۷ (۹) مجمع الزوائد ۱\۱۵۲
(۱۰) صحیح بخاری (۱۱) مسند احمد ۲۰۷
(۱۲) ابو داؤد ۲\۷۷ (۱۳) فتح الباری ۱\۱۸۴
(۱۴) السنہ ومکانتہا فی التشریع ۲۳۴ (۱۵) مفتاح الجنہ ۲۵
(۱۶) زاد المعاد ۲\۹۶ (۱۷) مقدمہ صحیح مسلم ۱\۱۰
(۱۸) ایضاً (۱۹) جامع بیان العالم ۱\۹۴
(۲۰) ایضاً (۲۱) ایضاً

درسِ نظامی: اور اصلاحِ نصاب کے اصول و مبادی

مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دار العلوم (وقف) دیوبند

ادیان مذاہب اور افکار و نظریات، صرف اپنی تعلیم ہی کی بنیاد پر آمدہ رہتے ہیں، اور انکی زندگی کے لئے علم کے لامحدود گلزار میں سے ایسے مخصوص و متناسب پھولوں کے انتخاب کا کام "تشکیل نصاب" ہے، کہ جن سے اس گلزار کی تمام رونقیں اور رنگ برنگ پھولوں کی تمام خوشبوئیں اس میں سمٹ آئیں۔

یا دوسری تعبیر میں یوں کہیے کہ علم "ایک ارتقاء پزیر حقیقت ہے اور اس کا ارتقاء اسکی یہ تسلسل "تسہیل و توسیع" میں پنہاں ہے اور "فکر انسانی" کی رفیق، علم کے اسی ارتقائی عمل سے وابستہ ہونے کی وجہ سے "تشکیل نصاب" کی اہمیت کو مزید اور غیر معمولی طور پر بڑھا دیتی ہیں، پس اسی تسہیل و توسیع علم کی صلاحیتوں کو ابھارنے والے ذریعہ کو اصطلاح "نصاب تعلیم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، لہٰذا اسی صلاحیت ہمہ جہت ترقی، کسی نصاب کی "صحت" کا معیار گردانی جائیگی اور اسکی محدود ترقی، یا عدم ترقی اس کے ناقص یا نادرست ہونے کی علامت قرار دی جائے گی اور تشکیل نصاب میں یہ طرز فکر بر حقیقت کو اصولی حیثیت عطا کر دیتا ہے کہ نصاب میں بہ تقاضائے وقت یا برعایت ضرورت، بعض علوم و فنون کو ترجیح دینا، لبسا اوقات ناگزیر بن جاتا ہے، یہ ترجیحی ضرورت ضرور پوری کی جانی چاہیے لیکن اسی طرح کہ مرجوح علوم و فنون کی تسہیلی اور توسیعی ترقی میں یہ ترجیح سدراہ نہ بننے پائے۔ کیوں کہ یہ ہی وقت اور ضرورت پر اور تقاضا بدلکر، آج کے راجح کو کل مرجوح بھی بنا سکتے ہیں، اسی سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوجاتی ہے کہ "نصاب" کی تشکیل، علوم و فنون کی راجحیت اور مرجوحیت پر نہیں بلکہ تسہیل و توسیع علوم کی صلاحیتوں کی بیداری پر مبنی ہے، اور اسی پر اس فکری ارتقاء کا بھی مدار ہے کہ جو اقوام و امم کی رفعت و عظمت کی کلید بنتا ہے۔

برصغیر میں "دینی مدارس" کا نصاب مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد تسہیلی اور توسیعی صلاحیت کے ارتقاء کی فی الجملہ مقصدیت سے کبھی خالی نہیں رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ کتاب و سنت کے ھمہ جہت مقصدی علوم ،انسان کے لئے زندگی کی گوناں گوں حیات و ضروریات پر مشتمل "علوم آلیہ" میں تسہیلی اور توسیعی خدمات، سست رفتاری کے ساتھ ہی سہی، لیکن جاری ضرور ہیں۔ جس پر حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے مبارک دور سے، قاسم العلوم والخیرات، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ کے عہد میمون تک، مختلف اسلامی مکاتب فکر کی، دینی، علمی، تحقیقی، عرفانی، تمدنی، تہذیبی، معاشرتی، معیشتی، ادبی، اور معقولاتی، علوم آلیہ پر مشتمل، کتاب و سنت کی روشنی میں تسہیل و توسیع کی حامل تالیف و تصانیف کو شاہد عدل بنایا جا سکتا ہے۔

اس تدریجی علمی ارتقاء نے جہاں کتاب و سنت کی مقصدی رفعت و عظمت کو برقرار رکھا۔

وہیں ان علوم آلیہ کے وقیع و جامع ستون پر مشتمل، تدریسی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر، جو جامع " نصاب تعلیم " وجود پذیر ہوا، وہی وہ " درس نظامی " ہے کہ جسنے برصغیر کے دینی علمی حلقوں میں مثالی قبولیت عامہ حاصل کی۔

اور اس " درس نظامی " کا یہ امتیاز بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ اسکی مقبولیت کو اپنے عہد آغاز ہی سے، جہاں وسائل علم و خبر اور ذرائع نقل و حمل کا ماضی کے مقابلے پر تیز رفتار دور میسر آیا، جس نے اس کے حلقئہ معتقدین کو، بہت جلد ملک گیر بنا دیا وہیں فکری جمود پر مبنی اسکی قدردانی نے نسلا بعد نسل تسہیل و توسیع کی راہوں سے علم کی ارتقاء پذیری کے تصور کو اسی تیز رفتاری کے ساتھ، ضعف و اضمحلال سے دوچار بھی کردیا، اور یہ وسیلہ علم، مقصدی علم پر اسی عدم ارتقاء کے نتیجے میں اسی حد تک فائق بن گیا، گویا اسی نصاب کی جو مقبولیت عامہ اس کے لئے ذریعہ ارتقاء بنی وہی مقبولیت، بعنوان قدردانی، بعد چندے اسکے لئے وسیلہ جمود بھی بن گئی، حتی کہ عربی زبان کی فنی اور لغوی اہمیت پر درس میں اتنے وقیع پیمانے پر ملحوظ رکھی گئی کہ اسکی پیدا کردہ استدلالی اور استنباطی قوت و صلاحیت کے ذریعہ کتاب سنت سے مسائل وقت کے حل کی وقیع ضرورت پر درجہ علمی بلند معیاری کے ساتھ پوری ہوتی رہی کہ خود اہل زبان ارباب علم نے اس کا اعتراف کیا، لیکن عربی زبان کی وہ لسانی حیثیت کہ جو اظہار مافی الضمیر کا اولین اور ضروری وسیلہ ہوتی ہے، وہ بالغ الفکر اہل علم و فکر کے استثناء کے ساتھ، بیشتر مدارس و معاہد میں اس درجہ معرض خمول میں پڑگئی کہ اہل نظر اگر اسکی ضرورت وہ اہمیت کو بدلائل و وجوہ ثابت کر کے پیش کرتے ہیں، تو اس کو ماننے یا قابل غور قرار دئے جانے کے بجائے۔ دور از کار، بے ضرورت اور غیر مفید بلکہ مضر ہونیکی تاویلات کی صورت میں عموما اس کا جواب ملتا ہے۔

پس اس درس عربی میں جبکہ عربی کی لسانی حیثیت سے بے التفاتی کا درجہ یہ ہو، تو وقت کی دیگر زندہ اور عالمگیر زبانیں تو اس گردو پیش میں زیر تذکرہ لانے کے قابل بھی نہیں سمجھی گئیں اور نہ سمجھی جاسکتی تھیں، اور خاص طور پر دور حاضر میں ملت اسلامیہ اور دیگر اقوام کے درمیان بڑی حد تک مدار رابطہ، بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے " انگریزی " ہی ہو سکتی تھی، لیکن وہ عالمگیر ہونے کے باوجود، بدقسمتی سے برصغیر تک اس ظالم و غاصب انگریز قوم کے ذریعہ پہنچی کہ جسنے نہ صرف مسلمانوں سے اقتدار ہی چھینا تھا۔ بلکہ اسکی معاندانہ کوششیں " دین اسلام " کو بھی برصغیر میں قصہ پارینہ بنادینے کی تھیں، پس انگریزوں سے عداوت کا یہ تاریخی اور برمحل پس منظر، انگریزی زبان کی عالمگیری تسلیم کرنے اور اس سے عالمی روابط میں استفادہ کی راہ میں سد سکندری بن گیا، اور نتیجتہ علم کی قدیم و جدید کے دو دائروں میں، غیر اسلامی، غیر واقعی اور غیر فطری تقسیم نے، بعد چندے، ملت اسلامیہ کو خدا، رسول، دین اور قبلہ کی وحدتوں کے باوجود، دو متباعد طبقوں میں تقسیم کردیا۔

دوسری جانب اقتدار مسلط کا ہمنوا جدت پسند طبقہ بھی، اپنی انتہا پسندی میں، مخالف اقتدار وقت قدامت پسند طبقہ سے پیچھے نہیں رہا، اور اس نے کتاب و سنت کے بارے میں، زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی تاریخ ساز اور عہد آفریں ان صلاحیتوں کے عملا انکار کو اپنا ترقی اور جدت پسندانہ موقف قرار دیا کہ جسنے پچاس سال کے مختصر ترین وقت میں، مذہبی معتقدات، اور تہذیبی اور تمدنی روایات کا زبردست اختلاف رکھنے والی قوموں کی زندگیوں میں وہ ناقابل فراموش تاریخی

انقلاب برپا کیا کہ جسکی کوئی مثال اسلام سے قبل یا بعد کی تاریخ اقوام و ملل نہ آج تک پیش کر سکی ہے اور نہ کبھی کر سکے گی۔

اس موقعہ پر نفس موضوع کے لحاظ سے ہر حقیقت کی پردہ کشائی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ " دین " کہ جسنے تمام جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر، اپنا مخاطب، اس باشعور عالم انسانی کو بنایا کہ جو رنگ و نسل، تہذیب و تمدن، کلچر و معاشرت، اقتصاد و معیشت، علوم و افکار، نظریات و معتقدات، آب و ہوا اور مرزوبوم کے لئے نہایت اختلافات رکھنے والی، مختلف المزاج اقوام پر مشتمل تھا، ان کے لئے مذاہب، عقل فقہاء کے دخل کی وجہ سے، مسالک ماخوذہ، راسخین فی العلم کی عقل کے دخل کی وجہ سے ہے اور مشارب کے عقل سے فروتر ذوق کے دخل کی وجہ سے، لائق تسلیم یا قابل توجہ نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ جوہر عقل نسل انسانی کی متاع مشترک ہے، اور اسمیں تفاوت و کمی بیشی کے باوصف، کسی دوسرے کی برتری کو فطرت انسانی بآسانی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتی، اسی لئے یہ فقہی مذاہب ماخوذ مسالک اور ذوقی مشارب، شروع ہی سے محل اختلاف بنے رہے، جسکے معنی یہ ہیں کہ یہ تینوں چیزیں ترجیحاً تو پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن تبلیغاً انکو پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں نکلتا، اور جب سے انکو تبلیغی درجہ دیدیا گیا، تب ہی سے امت گوناگوں اختلافات کا شکار بنتی رہتی ہے، تبلیغی چیز صرف اللہ رب العزۃ کا نازل فرمودہ وہ " دین " ہی ہو سکتا ہے کہ جو بواسطہ انبیاء کرام علیہم السلام آتا ہے، اور انسانیت کے لئے اس کے قابل قبول یا لائق تصور بننے کی وجہ صرف یہ ہی ہوتی ہے کہ وہ عقل کے استنباط و استدلال کے دخل سے یکسر خالی ہوتا ہے اور اپنے عمومی جزو کل کے لحاظ سے جہاں خلاف عقل نہیں ہوتا، وہیں اس کے رفیع و وقیع مسلمات کا، بعض عقلوں سے بلند و ماوراء ہونا بھی غیر ممکن ہوتا ہے۔

اسی سے دینی تعلیم کی نصاب سازی کا ایک دوسرا اصول یہ سامنے آتا ہے کہ متعلمین کی تعلیماً ذہن سازی اس اصول پر کی جانی چاہیے کہ وہ اولیت و مقصدیت اور تبلیغی حیثیت، عقل کی ہر آمیزش سے پاک و صاف، صرف منزل من اللہ دین کو دین اور عقل کے ذریعہ مستنبط کردہ، فقہی مذاہب، ماخوذ مسالک اور ذوقی مشارب، بوقت ضرورت اور بشرط ضرورت ترجیحاً پیش کریں، تبلیغی حیثیت انہیں ہرگز نہ دیں، اور دوسروں کی جانب سے پیش کردہ مذاہب، مسالک اور مشارب کے بارے میں انہیں پورے طور پر وسیع الفکر اور متحمل المزاج بنایا جائے، ورنہ بصورت دیگر ان ترجیحی امور کو دین کے ہم پلہ بنا کر تبلیغی درجہ دینا، نہ صرف شرعاً ہی غیر صحیح اور ناصواب ہوگا، بلکہ اختلاف امت کا عظیم سبب بن جانے کی وجہ سے، عقلاً بھی اسے غلط نادرست اور خلاف مصلحت قرار دیا جائے گا، لہذا ترجیح و تبلیغ کا یہ فرق بذیل تعلیم آکر، نصاب ہی کا اہم ترجزو بن جاتا ہے۔

رائج الوقت " درس نظامی، زیادہ تر متون پر مشتمل ہے، جسکی بیشتر فنی کتب اپنی جامعیت معانی، اور اختصار تعبیر کی وجہ سے جہاں غیر معمولی طور پر محنت طلب ہیں، وہیں اس کے یہ متانج بھی کسی دلیل کے محتاج نہیں ہیں کہ استدلال و استنباط کی قرار واقعی وہ صلاحیت یہ نصاب پیدا کرتا رہا ہے کہ جس سے کتاب و سنت کے غوامض، اور پیش آمدہ مسائل کے اطراف و جوانب کے انکشاف سے حل مسائل میں آسانی میسر آتی ہے، لیکن اب تو ایسے معلمین و متعلمین نہ حل عبارات میں غیر معمولی محنت کے متحمل رہے اور نہ فہم مرادات میں تعمق فکر کے عادی ہیں اور ہر مشکل الفہم کتب

نصاب نہ صرف تسہیلی لحاظ ہی سے غیر محدود ہی رہیں، بلکہ تسہیل کو ان ستون کی مرقوائے افادیت کا ختم کردینے والا قرار دے دیا گیا، اور جواباً اگر ان حقوق نصاب کے اردو تراجم اور اردو شرح کو پیش بھی کیا جائے تو یہ کاوشیں فنی تسہیل و توسیع کے زمرے میں شمار نہیں کی جاسکتیں، اور یہ امر مستہزاد بھی ہر مرحلے پر قابل ذکر ہے کہ ان کاوشوں اور محنتوں کے باوجود، موجودہ دور میں اس نصاب کی بعض نئی کتب، عدم محنت کی وجہ سے اور بعض کتب عدم ضرورت کی وجہ سے دینی سابقہ افادیت برقرار نہیں رکھ سکیں، - اس کے نتیجہ میں علم کے مسائل بجمود ہونے کی رفتار تیز ہو رہی ہے اور قلت استعداد تجدد و متنوع مسائل حیات میں، دینی حل آفرینی کو دشوار تر بناتی جا رہی ہے۔

اس لئے یہ درس نظامی، کثیر الافادہ ہونے کے باوجود بوجوہ مذکورہ اصلاحاً قابل اعتناء تو یقیناً ہے، لیکن اصلاح کے اہل اور مستحق صرف وہی حضرات ہوسکتے ہیں کہ جو علم کی حقیقت محرکہ کے لئے جمود قرار دئے ہوں، اور تنقید و تنقیص میں امتیاز قائم کرنے کے ساتھ تسہیل و توسیع علم کے حقیقی آشنا بھی ہوں۔

بر سبیل اجمال اسی نصب ب کے تجرباتی افادہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے، درج ذیل تقسیمات کے ذریعہ بھی اصلاحی قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔

(۱) مدارس عربیہ کے معدودے چند وہ پرشوق اور باذوق طلبہ بھی، عدداً کم نہ ہونے کے باوجود آتے ضرور ہیں کہ جو اپنی بلند فکری، علم کے ذوق سلیم اور غیر معمولی مطالعاتی محنتوں کے متحمل اور شائق ہوتے ہیں، ان کے لئے یہ ہی نصاب، علوم آلیہ میں عصری ضرورتوں کے لحاظ سے جزوی فرق کے ساتھ بحالہ برقرار رکھا جائے، تاکہ ڈیڑھ سو سالہ تجربات کے مطابق وسیع العلم اور وسیع الفکر مدرسین، ارباب افتاء، فقہا، محدثین، مفسرین، اور مصنفین، امت کو اقل قلیل ہی سہی، لیکن برابر حاصل ہوتے رہیں۔

(۲) اول الذکر طبقے سے بہت زیادہ تعداد میں مدارس دینیہ میں آنے والے طلبہ وہ ہوتے ہیں کہ جو نہ دین کا قابل ذکر ذوق ہی رکھتے ہیں اور نہ دینی علوم کی طلب کا شوق ہی انہیں ہوتا ہے، ایسے طلبہ بالعموم آتے ہیں، بلکہ ان کے اولیاء اپنی خاندانی مذہبی روایات کی برقراری کے لئے انہیں بہر صورت مدارس دینیہ ہی میں بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں، یہ کثیر التعداد طلبہ، عدم ذوق، و عدم طلب کی بنیاد پر فر[illegible]ت کے بعد نہ کسی دینی منصب کو حاصل کر پاتے ہیں اور نہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہی ان کے ا[illegible]تی ہے۔

[illegible] طبقے کے لئے ضرورت ہے کہ نصاب مرجہ کے مقصدی دینی علوم کے منتخبات پر مشتمل ایک [illegible] ار سالہ نصاب مرتب کیا جائے، یہ نصاب نہ صرف اس مقصد ہی کو پورا کر کے انکے اولیاء کو مطم[illegible] رہے گا کہ ان کے بچے دینی علم اور دینی تعلیم گاہ کی جانب منسوب ہوجائیں گے۔ بلکہ جلد ہی انکو وہ فراغ بھی میسر آسکے گا کہ جسمیں وہ اپنے طبعی میلان کے مطابق کوئی فن یا علم حاصل کر کے اپنے ذوق کی تکمیل بھی کر سکیں گے۔

(۳) اسی طرح ایک تیسرا اور کافی بڑا طبقہ ان مدارس دینیہ میں ان طلبہ کا بھی آتا ہے کہ جو نہ اول

الذکر کی طرح ذوق علم ہی کے حامل ہوتے ہیں، اور نہ ثانی الذکر کی طرح، خاندانی روایات کی برقراری کے کسی بوجھ تلے وہ دبے ہوئے ہی ہوتے ہیں، بلکہ صرف اہل علم و دین سے اور کسی درسگاہ سے انتساب کامل جانا ہی ان کا آخری مطمح نظر ہوتا ہے، اور اس انتساب سے ان کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے حلقے یا ماحول میں، جہل کی جانب انتساب سے محفوظ ہوجائیں، ان کے لئے ضرورت ہے کہ مبادیات دین پر مشتمل اردو نصاب مرتب کیا جائے کہ جس سے یہ طبقہ اپنی عام زندگی میں اور اپنے معاشی و معشیت میں حدود دین کو فی الجملہ ملحوظ رکھ سکے کہ یہی اس کا حقیقی مقصد و مدعا ہے۔

اور مدارس دینیہ ان تینوں طبقات کو ان کے تعلیمی معیار و صلاحیت کے مطابق بوضاحت الفاظ علحدہ علحدہ سندات جاری کریں، یہ طریق عمل نصاب مروج کی افادیت کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بھی بنے گا اور وہ فرق مراتب بھی قائم ہوسکے گا کہ جسکے آج نہ ہونے سے دینی حلقوں میں افسوسناک حوادث و واقعات رونما ہورہے ہیں۔

قلت وقت کے باعث، موضوع پر درس نظامی کے بارے میں قلم برداشتہ یہ خیالات پریشاں، بقید تحریر پیش خدمت گرامی کررہا ہوں۔

چند کلمے ہیں، تکلف برطرف — گر قبول افتدز ہے عز و شرف

****

• خبرنامہ کا بقیہ •

اس جلسہ کے مہمان خصوصی تھے، مولانا موصوف اس موقع سے دارالعلوم بھی تشریف لائے اور یہاں کی کارکردگی پر مسرت کا اظہار فرمایا۔

محترم حافظ عبدالرشید صاحب عامل جامعہ نے بھی امسال بحری جہاز سے بیت اللہ شریف کا سفر کیا اور حج کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔

مورخہ ۲۱ محرم ۱۴۱۱ھ کو مولانا خلیل الرحمن سجاد ندوی جامع ہذا تشریف لائے اور اساتذہ وطلبہ سے خطاب کرتے ہوئے اہم اور بنیادی باتوں کی طرف متوجہ فرمایا اور خصوصیت سے تخصص فی الفقہ کے شعبہ کی بہت تحسین فرمائی۔

جناب الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب نے مختلف علاقوں کے تبلیغی اور دعوتی اسفار فرمائے۔

جناب الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب صدر مجلس انتظامی اور حضرت مولانا محمد رضوان صاحب (ناظم) کے زیر نگرانی جدید تعمیر کی تکمیل کا کام تیزی کے ساتھ جاری ہے خدا کرے جلد یہ عمارت پایہ تکمیل کو پہنچے۔

قرآنِ حکیم، علامہ اقبالؒ کے افکار کا سرچشمہ

محمد رضوان القاسمی

"آپ نے مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں اب تک پڑھی ہیں، ان میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کون سی گزری ہے"۔ ؟علامہ اقبال سے ان کی قیامگاہ پر ایک نئے ملاقاتی نے سوال کیا، وہ اس سوال کے جواب میں کرسی سے اٹھے اور نووارد ملاقاتی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں، یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے، دو تین منٹ میں واپس آئے تو انکے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اس کتاب کو انہوں نے اس شخص کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے فرمایا "قرآن مجید"۔ (روز گار فقیر صفحہ ۹۳، ۹۲)۔

اس واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ اقبال (۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸) مختلف علوم و فنون میں لکھی گئی دنیا کی بے شمار کتابوں میں ایک کثیر المطالعہ اور جہاندیدہ شخص ہونے کی حیثیت سے قرآن حکیم کو وہ کس نظر سے دیکھتے اور اسے کیا اہمیت دیتے تھے، علامہ اقبال کو قرآن حکیم کی اہمیت کا جو احساس تھا وہ ان کی عام بات چیت، نظم و نثر، شاعری، مکاتیب، مقالات، خطبات میں ہر جگہ ملتا ہے، درج ذیل تصریحات سے اس حقیقت کی تائید و توثیق ہو سکے گی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کو سرراس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی، اسی طرح سرراس کو اقبال سے بڑا شغف تھا، لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی، اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت و آرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کردیا تھا، جو ہر صبح آدھے گھنٹے تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے، یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی مسعود کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی، ڈاکٹر اقبال فرمایا کرتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا، ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے "ارمغان حجاز" میں دختران ملت کو یوں خطاب کیا ہے۔

زشام ما بروں آور سحر را به قرآن باز خواں اہل نظر را
تو می دانی که سوز قرات تو دگرگوں کرد تقدیر عمر را

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کے لئے فوراً آمادہ کرے، مرحوم خود بھی خیال رکھتے تھے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں، ایک دن مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوئے ہیں، لیڈی مسعود

کہاں ہیں، علی بخش نے قدرے آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا قرآن کیا سنیں گی، وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول توڑنے چلی جاتی ہیں، وہاں سے فرصت ملے تو آئیں، میں کیا کروں، مرحوم خاموش ہو گئے، فرمایا، صبر، علی بخش صبر، یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے ۔۔اس واقعہ پر رشید احمد صدیقی اپنے خاص انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی سا جملہ ان کی فکر و فرزانگی، شاعری و شخصیت اور ان کا مجموعہ ان کی ماورائی بصیرت کا ترجمان ہے، یہ وہ مقام ہے، جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سے آپ سے بڑے ہیں، منفرد و ممتاز ہو جاتے ہیں، اور ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو در کنار ان کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے ۔ (گنجہائے گرانمایہ ص ۱۵۹، ۱۵۸)۔

علامہ اقبال کے نزدیک قرآن، مسلمانوں کے تہذیبی ورثہ کی خشت اول ہے، اسلئے وہ کہتے ہیں۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

(اگر تم بحیثیت مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہو تو تمہاری زندگی قرآن کے بغیر ممکن نہیں)

جاوید نامہ میں خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژاد نو) کے عنوان میں یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

سینہ ہا از گرمئ قرآں تہی　　از چنیں مرداں چہ امید بہی

(یعنی زندگی اور حرارت سینہ میں قرآن کی گرمی سے ہے، مسلمان کا سینہ اگر اس سوز سے محروم ہو تو پھر بقول خود ان کے ع

مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اور اسی عنوان میں یہ شعر بھی ہے۔

صاحب قرآن و بے ذوق طلب　　العجب، ثم العجب ۔ ثم العجب

اس کے ساتھ یہ شعر بھی قابل توجہ ہے۔

مرد مومن و اعزیز اے نکتہ رس　　چیست جز قرآن و شمشیر و فرس

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ حقیقی علم، علم قرآن ہے، اور عصر حاضر کا المیہ یہی ہے کہ عالم، علم قرآن سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔

عالماں از علم قرآں بے نیاز　　صوفیاں درندہ گرگ و مو دراز

اس سلسلہ میں جاوید نامہ میں ایک عنوان بڑا اثر انگیز ہے ۔ یہ "قیصر شرف النساء" ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب علامہ اقبال اپنے سفر افلاک میں مرشد رومی کی معیت میں جنت الفردوس میں پہنچتے ہیں تو انہیں ایک نہایت رفیع و روشن قصر نظر آتا ہے، علامہ اقبال کے استفسار پر مرشد رومی بتاتے ہیں کہ یہ محل شرف النساء کا ہے جو حاکم پنجاب نواب عبد الصمد خاں کی دختر نیک اختر تھی، اس پاکیزہ سیرت خاتون کو قرآن سے عشق تھا، اس کا بیشتر وقت قرآن کی تلاوت میں گزرتا، اور اس

نصاب نہ صرف تسہیلی لحاظ ہی سے غیر محدود ہی رہیں، بلکہ تسہیل کو ان ستون کی مرقوائے افادیت کا ختم کردینے والا قرار دے دیا گیا، اور جواباً اگر ان حقوق نصاب کے اردو تراجم اور اردو شرح کو پیش بھی کیا جائے تو یہ کاوشیں فنی تسہیل و توسیع کے زمرے میں شمار نہیں کی جاسکتیں، اور یہ امر مستہزاد بھی ہر مرحلے پر قابل ذکر ہے کہ ان کاوشوں اور محنتوں کے باوجود، موجودہ دور میں اس نصاب کی بعض نئی کتب، عدم محنت کی وجہ سے اور بعض کتب عدم ضرورت کی وجہ سے دینی سابقہ افادیت برقرار نہیں رکھ سکیں، اس کے نتیجہ میں علم کے مائل بجمود ہونے کی رفتار تیز ہورہی ہے اور قلت استعداد تجدد و متنوع مسائل حیات میں، دینی حل آفرینی کو دشوار تر بناتی جارہی ہے۔

اس لئے یہ درس نظامی، کثیر الافادہ ہونے کے باوجود بوجوہ مذکورہ اصلاحاً قابل اعتناء تو یقیناً ہے، لیکن اصلاح کے اہل اور مستحق صرف وہی حضرات ہوسکتے ہیں کہ جو علم کی حقیقت محرکہ کے لئے جمود قرار دئے ہوں، اور تنقید و تنقیص میں امتیاز قائم کرنے کے ساتھ تسہیل و توسیع علم کے حقیقی آشنا بھی ہوں۔

بر سبیل اجمال اسی نصب ب کے تجرباتی افادہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے، درج ذیل تقسیمات کے ذریعہ بھی اصلاحی قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔

(۱) مدارس عربیہ کے معدودے چند وہ پرشوق اور باذوق طلبہ بھی، عدداً کم نہ ہونے کے باوجود آتے ضرور ہیں کہ جو اپنی بلند فکری، علم کے ذوق سلیم اور غیر معمولی مطالعاتی محنتوں کے متحمل اور شائق ہوتے ہیں، ان کے لئے یہ ہی نصاب، علوم آلیہ میں عصری ضرورتوں کے لحاظ سے جزوی فرق کے ساتھ بحالہ برقرار رکھا جائے، تاکہ ڈیڑھ سو سالہ تجربات کے مطابق وسیع العلم اور وسیع الفکر مدرسین، ارباب افتاء، فقہاء، محدثین، مفسرین، اور مصنفین، امت کو اقل قلیل ہی سہی، لیکن برابر حاصل ہوتے رہیں۔

(۲) اول الذکر طبقے سے بہت زیادہ تعداد میں مدارس دینہ میں آنے والے طلبہ وہ ہوتے ہیں کہ جو نہ دین کا قابل ذکر ذوق ہی رکھتے ہیں اور نہ دینی علوم کی طلب کا شوق ہی انہیں ہوتا ہے، ایسے طلبہ بالعموم آتے ہیں، بلکہ ان کے اولیاء اپنی خاندانی مذہبی روایات کی برقراری کے لئے انہیں بہر صورت مدارس دینیہ ہی میں بھیجنا ضروری سمجھتے ہیں، یہ کثیر التعداد طلبہ، عدم ذوق، وعدم طلب کی بنیاد پر فـ ت کے بعد نہ کسی دینی منصب کو حاصل کرپاتے ہیں اور نہ حاصل کرنے کی صلاحیت ہی ان کے ا تی ہے۔

طبقے کے لئے ضرورت ہے کہ نصاب مرجہ کے مقصدی دینی علوم کے منتخبات پر مشتمل ایک ارسالہ نصاب مرتب کیا جائے، یہ نصاب نہ صرف اس مقصد ہی کو پورا کرکے انکے اولیاء کو مطمٔ رے گا کہ ان کے بچے دینی علم اور دینی تعلیم گاہ کی جانب منسوب ہوجائیں گے۔ بلکہ جلد ہی انکو وہ فراغ بھی میسر آسکے گا کہ جسمیں وہ اپنے طبعی میلان کے مطابق کوئی فن یا علم حاصل کرکے اپنے ذوق کی تکمیل بھی کرسکیں گے۔

(۳) اسی طرح ایک تیسرا اور کافی بڑا طبقہ ان مدارس دینیہ میں ان طلبہ کا بھی آتا ہے کہ جو نہ اول

الذکر کی طرح ذوق علم ہی کے حامل ہوتے ہیں، اور نہ ثانی الذکر کی طرح، خاندانی روایات کی برقراری کے کسی بوجھ تلے وہ دبے ہوئے ہی ہوتے ہیں، بلکہ صرف اہل علم و دین سے اور کسی درسگاہ سے انتساب کامل جانا ہی ان کا آخری مطمح نظر ہوتا ہے، اور اس انتساب سے ان کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے حلقے یا ماحول میں، جہل کی جانب انتساب سے محفوظ ہوجائیں، ان کے لئے ضرورت ہے کہ مبادیات دین پر مشتمل اردو نصاب مرتب کیا جائے کہ جس سے یہ طبقہ اپنی عام زندگی میں اور اپنے معاشی و معیشیت میں حدود دین کو فی الجملہ ملحوظ رکھ سکے کہ یہی اس کا حقیقی مقصد و مدعا ہے۔

اور مدارس دینیہ ان تینوں طبقات کو ان کے تعلیمی معیار و صلاحیت کے مطابق بوضاحت الفاظ علحدہ علحدہ سندات جاری کریں، یہ طریق عمل نصاب مروج کی افادیت کو برقرار رکھنے کا ذریعہ بھی بنے گا اور وہ فرق مراتب بھی قائم ہوسکے گا کہ جسکے آج نہ ہونے سے دینی حلقوں میں افسوسناک حوادث و واقعات رونما ہورہے ہیں۔

قلت وقت کے باعث، موضوع پر درس نظامی کے بارے میں قلم برداشتہ یہ خیالات پریشاں، بقید تحریر پیش خدمت گرامی کررہاہوں۔

چند کلمے ہیں، تکلف برطرف گر قبول افتدز ہے عز و شرف

****

• خبرنامہ کا بقیہ •

اس جلسہ کے مہمان خصوصی تھے، مولانا موصوف اس موقع سے دارالعلوم بھی تشریف لانے اور یہاں کی کارکردگی پر مسرت کا اظہار فرمایا۔

محترم حافظ عبدالرشید صاحب عامل جامعہ نے بھی امسال بحری جہاز سے بیت اللہ شریف کا سفر کیا اور حج کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔

مورخ ۲۱ محرم ۱۴۱۱ھ کو مولانا خلیل الرحمن سجاد ندوی جامع ہذا تشریف لانے اور اساتذہ و طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے اہم اور بنیادی باتوں کی طرف متوجہ فرمایا اور خصوصیت سے تخصص فی الفقہ کے شعبہ کی بہت تحسین فرمائی۔

جناب الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب نے مختلف علاقوں کے تبلیغی اور دعوتی اسفار فرمائے۔

جناب الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب صدر مجلس انتظامی اور حضرت مولانا محمد رضوان صاحب (ناظم) کے زیر نگرانی جدید تعمیر کی تکمیل کا کام تیزی کے ساتھ جاری ہے خدا کرے جلد یہ عمارت پایہ تکمیل کو پہنچے۔

قرآنِ حکیم، علامہ اقبالؒ کے افکار کا سرچشمہ

محمد رضوان القاسمی

"آپ نے مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، تاریخ اور فلسفہ وغیرہ علوم پر جو کتابیں اب تک پڑھی ہیں، ان میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کون سی گزری ہے"۔ علامہ اقبال سے ان کی قیامگاہ پر ایک نئے ملاقاتی نے سوال کیا، وہ اس سوال کے جواب میں کرسی سے اٹھے اور نووارد ملاقاتی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں، یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے، دو تین منٹ میں واپس آئے تو انکے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اس کتاب کو انہوں نے اس شخص کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے فرمایا "قرآن مجید"۔ (روز گار فقیر صفحہ ۹۳، ۹۲)۔

اس واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷ء) مختلف علوم و فنون میں لکھی گئی دنیا کی بے شمار کتابوں میں ایک کثیر المطالعہ اور جہاندیدہ شخص ہونے کی حیثیت سے قرآن حکیم کو وہ کس نظر سے دیکھتے اور اسے کیا اہمیت دیتے تھے، علامہ اقبال کو قرآن حکیم کی اہمیت کا جو احساس تھا وہ ان کی عام بات چیت، نظم ونثر، شاعری، مکاتیب، مقالات، خطبات میں ہر جگہ ملتا ہے، درج ذیل تصریحات سے اس حقیقت کی تائید وتوثیق ہو سکے گی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کو سر راس مسعود مرحوم سے بڑی شیفتگی تھی، اسی طرح سر راس کو اقبال سے بڑا شغف تھا، لیڈی مسعود کو اقبال مرحوم سے جو عقیدت تھی، اور جس طور پر ڈاکٹر صاحب کی صحت وآرام کا موصوفہ خیال رکھتی تھیں، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بھوپال میں بڑے اصرار کے ساتھ ایک خوش الحان قاری مقرر کر دیا تھا، جو ہر صبح آدھے گھنٹے تک لیڈی مسعود کو کلام پاک سناتے، یہ وہ زمانہ تھا جب لیڈی مسعود کی دوسری بچی نادرہ پیدا ہونے والی تھی، ڈاکٹر اقبال فرمایا کرتے تھے کہ ایام حمل میں کسی خوش لہجہ قاری سے اگر ماں کلام پاک سن لیا کرے تو بچہ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا، ممکن ہے یہی خیال ہو جس کی بنا پر اقبال نے "ارمغان حجاز" میں دختران ملت کو یوں خطاب کیا ہے۔

زشام ما برون آور سحر را — بہ قرآن باز خواں اہل نظر را
تو می دانی کہ سوز قرات تو — دگرگوں کرد تقدیر عمر را

ڈاکٹر اقبال مرحوم کا ملازم علی بخش اس پر مامور تھا کہ قاری صاحب آئیں تو لیڈی مسعود کو کلام پاک سننے کے لئے فوراً آمادہ کرے، مرحوم خود بھی خیال رکھتے تھے کہ یہ فریضہ پورا ہوتا رہتا ہے یا نہیں، ایک دن مرحوم نے علی بخش کو آواز دی کہ قاری صاحب آئے ہوئے ہیں، لیڈی مسعود

کہاں ہیں، علی بخش نے قدرے آزردہ اور تلخ ہو کر اپنی زبان میں کہا قرآن کیا سنیں گی، وہ تو صبح ہی صبح باغ میں پھول توڑنے چلی جاتی ہیں، وہاں سے فرصت ملے تو آئیں، میں کیا کروں، مرحوم خاموش ہو گئے، فرمایا، صبر، علی بخش صبر، یہ کام بھی اتنا ہی ضروری ہے "۔ اس واقعہ پر رشید احمد صدیقی اپنے خاص انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اقبال کا یہی فیصلہ اور اتنا ہی سا جملہ ان کی فکر و فرزانگی، شاعری و شخصیت اور ان کا مجموعہ ان کی ماورائی بصیرت کا ترجمان ہے، یہ وہ مقام ہے، جہاں اقبال ہم سے آپ سے اور بہت سے دوسرے لوگوں سے جو ہم سے آپ سے بڑے ہیں، منفرد و ممتاز ہو جاتے ہیں، اور ان پہنائیوں میں داخل ہو جاتے ہیں جن کی تشریح تو درکنار ان کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے ۔ (گنجہائے گرانمایہ ص ۱۵۹، ۱۵۸)۔

علامہ اقبال کے نزدیک قرآن، مسلمانوں کے تہذیبی ورثہ کی خشت اول ہے، اسلئے وہ کہتے ہیں۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

(اگر تم بحیثیت مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہو تو تمہاری زندگی قرآن کے بغیر ممکن نہیں)

جاوید نامہ میں خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژاد نو) کے عنوان میں یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

سینہ ہا از گرمی قرآں تہی از چنیں مرداں چہ امید بہی

(یعنی زندگی اور حرارت سینہ میں قرآن کی گرمی سے ہے، مسلمان کا سینہ اگر اس سوز سے محروم ہو تو پھر بقول خود ان کے ع

مسلمان نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

اور اسی عنوان میں یہ شعر بھی ہے۔

صاحب قرآن و بے ذوق طلب العجب ثم العجب ۔ ثم العجب

اس کے ساتھ یہ شعر بھی قابل توجہ ہے۔

مرد مومن و اعزیز اے نکتہ رس چیست جز قرآن و شمشیر و فرس

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ حقیقی علم، علم قرآن ہے، اور عصر حاضر کا المیہ یہی ہے کہ عالم، علم قرآن سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔

عالماں از علم قرآں بے نیاز صوفیاں درندہ گرگ و مو دراز

اس سلسلہ میں جاوید نامہ میں ایک عنوان بڑا اثر انگیز ہے ۔ یہ "قیصر شرف النساء" ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب علامہ اقبال اپنے سفر افلاک میں مرشد رومی کی معیت میں جنت الفردوس میں پہنچتے ہیں تو انہیں ایک نہایت رفیع و روشن قصر نظر آتا ہے، علامہ اقبال کے استفسار پر مرشد رومی بتاتے ہیں کہ یہ محل شرف النساء کا ہے جو حاکم پنجاب نواب عبد الصمد خاں کی دختر نیک اختر تھی، اس پاکیزہ سیرت خاتون کو قرآن سے عشق تھا، اس کا بیشتر وقت قرآن کی تلاوت میں گزرتا، اور اس

اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہوں، پھر یہ سوال کیسا؟، نہایت نرمی سے فرمایا، میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ میں بھی آجاتا ہے؟، اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا اور کہا کچھ عربی جانتا ہوں، کہیں کہیں سمجھ میں آجاتا ہے۔ بات ختم ہو گئی، کوئی چھ ماہ بعد، ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا! بیٹا، قرآن کریم اس کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ جس پر یہ نازل ہوتا ہے، میں حیران تھا کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آہی نہیں سکتا، فرمایا، یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآن کریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا میں پھر حیران ہوا، تو فرمایا، انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے، اس کا نمونہ ہمارے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے، حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسٰی تک ہر نبی محمد ہی کے مختلف مدارج تھے، وہ سلسلے گویا (MOHAMMEDIN THE MAKING) (تکمیل محمد) کے منازل تھے، بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا۔ البتہ شعور انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی، حتی کہ محمد مکمل ہو گئے۔ باب نبوت بند ہو گیا، انسانیت اپنی معراج گرامی تک پہنچ گئی، اب ہر انسان کے سامنے معراج انسانیت کا نمونہ محمد (ص) موجود ہیں۔ کوئی انسان جتنا "محمدیت" کے رنگ میں رنگا جاتا ہے، اتنا ہی قرآن اس پر نازل ہوتا جاتا ہے، یہ مفہوم تھا، میرے کہنے کا کہ قرآن کریم اس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ (رسالہ فکر و نظر، اسلام آباد اگست سنہ ۱۹۷۶ صفحہ ۱۸)۔

علامہ اقبال کی یہی بات ایک دوسرے انداز سے مولانا عبدالسلام ندوی نے "اقبال کامل" میں اس طرح نقل کی ہے۔

"جب میں سیالکوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا، والد مرحوم اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک دن صبح کو میرے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتلاؤں گا، بالآخر انہوں نے ایک مدت کے بعد یہ بات بتائی اور ایک دن صبح کو جب میں حسب دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا، میرے پاس آئے، اور فرمایا بیٹا! کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔ (اقبال کامل صفحہ ۲-۳)

علامہ اقبال نے اپنے والد شیخ نور محمد مرحوم (وفات ۱۷ اگست سنہ ۱۹۳۰) ہی کی مذکورہ بالا ہدایت کے پیش نظر غالباً "بال جبریل" میں فرمایا ہے۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

علامہ اقبال کے نزدیک دنیا کی ہر کتاب اور ہر نظریہ میں غلطی ہو سکتی ہے مگر قرآن ہر طرح کی غلطی اور ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر، ہر اعتبار سے سچی، یقینی، محکم، اٹل اور مضبوط کتاب ہے، ایک دفعہ علامہ اقبال کے ایک شعر پر ایک صاحب نے اعتراض کیا تو علامہ نے فرمایا "میرا شعر قرآن کی آیت تو نہیں کہ اس پر اعتراض نہ ہو سکے"۔ (حیات اقبال صفحہ ۳۲۶)، گویا انہوں نے اس طرف توجہ دلائی کہ بڑے سے بڑے حکیم، فلاسفر، شاعر، سائنسداں اور اہل قلم کی بات، خیال اور نظریہ پر اعتراض کی گنجائش موجود ہے، لیکن اس سے کوئی مستثنیٰ ہے تو وہ خدا کی کتاب "قرآن"۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان - اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

ہے، علامہ اقبال یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کائنات کے ہر مسئلہ اور زندگی کے ہر شعبے میں کامل رہنمائی کرتا ہے، اس موضوع پر ایک دفعہ تفصیلی طور پر اظہار خیال کرتے ہوئے آخر میں فرمایا کہ جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق ہے، میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ میرے پاس کوئی پرائیوٹ سکریٹری ہے جو میرے لئے ضروری مواد فراہم کرے، نہ میرے پاس سیاسی لٹریچر کا کوئی پلندہ ہے جس پر میں اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں، بلکہ میرے پاس حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن پاک) ہے جس کی روشنی میں مسلمانان ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا----- لہذا میں نوجوانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوہ حسنہ کو پیش نظر رکھیں اور اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو وہ ان قربانیوں کے لئے تیار رہیں، جو ہمیشہ سے زیادہ ان کو آئندہ دینی ہوں گی۔ (گفتار اقبال صفحہ ۱۳۶)۔

جو لوگ نزول قرآن کے حقیقی مقصد سے ہٹ کر غیر ضروری چیزوں میں الجھے ہوئے۔ مختلف قسم کے ادعاء اور فخر و مباحات میں پھنسے ہوئے اور خدا کی اس عظیم، بے مثال آخری اصلاحی اور دعوتی کتاب کو رسوم و رواج اور صرف ظاہری ادب و احترام کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، ان کے لئے علامہ اقبال کا صحیح قرآنی ذوق و شوق اور تعلق و انہماک موجب موعظت و عبرت ہے، اور ہر "مرد مسلمان" کے لئے ان کا یہ مخلصانہ پیغام ہے۔

****

علم وفضل میں عورتوں کا مقام

مولوی محمد ظفر عالم ندوی (تخصص فی الفقہ دوم)

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اسلام نے اپنے تمام شعبوں کی طرح علم کے شعبہ کو بھی بہت وسیع اور مرد و عورت بلکہ ہر طبقہ انسانی کے لئے عام کر دیا ہے، یہ دروازہ نہ کسی کے لئے بند ہے اور نہ تنگ، بلکہ اسلام اسمیں ہر داخل ہونے والے اور اس میدان میں ہر اترنے والے کو فضیلت و شان کا مژدہ بھی سنایا ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات اور احادیث نبوی کا ایک معتدبہ ذخیرہ اسی کا ایک حصہ ہے۔

ابن ماجہ کی ایک روایت ہے جو حضرت انس بن مالک سے مروی ہے کہ "طلب العلم فریضتہ علی کل مسلم۔(۱) یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلم پر فرض ہے، بعض شراح حدیث کے بقول یہ لفظ مسلم" مرد و عورت ہر دو کو شامل ہے، ملا علی قاری، نے مرقاہ شرح مشکوۃ میں اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے کہ مسلم کے ساتھ مسلمہ بھی شامل ہے، قاری تحریر فرماتے ہیں۔" ای مسلمہ کمانی روایتہ۔(۲) یعنی مسلم کے ساتھ مسلمہ بھی داخل ہے، جیسا کہ ایک روایت میں موجود ہے، یہ روایت واضح طور پر بتاتی ہے کہ مرد و عورت ہر دو جنس پر علم کا حاصل کرنا ایک اہم فریضہ ہے، بعض رویات بھی اس طرح کی ہیں، جن میں صرف عورتوں سے خطاب کیا گیا ہے، ان میں سے ایک مشہور روایت جو مسلم شریف میں ہے یہ ہے۔

یا معشر النساء تصدقن واکثرن الاستغفار فانی رأیتکن اکثر اھل النار فقالت امراہ منھن جزلہ ومالنا یا رسول اللہ اکثر اھل النار۔؟ قال تکثرن اللعن وتکفرن العشیر مارائیت من ناقصات عقل ودین اغلب لذی لب منکن قالت یارسول اللہ وما نقصان العقل والدین؟ قال اما نقصان العقل فشہادت امراتین تعدل شہادہ رجل فھذا نقصان العقل، وتمکث اللیالی ما تصلی وتفطر فی رمضان فھذا نقصان الدین۔

(۱) اے عورتوں کی جماعت صدقہ کرو اور خوب استغفار کیا کرو اسلئے کہ میں نے دیکھا ہے کہ تم میں سے اکثر دوزخیوں میں ہوں گی ان میں سے ایک عقلمند عورت نے عرض کیا یارسول اللہ کیا وجہ ہے کہ عورتیں اکثر جہنمی ہوں گی، آپ نے فرمایا کہ وہ لعن طعن بہت زیادہ کرتی ہیں، اور شوہروں کی ناشکری کرتی رہتی ہیں، میں نے عقل و دین میں ناقص رہنے والیوں میں سے سوائے عورت کے کسی کو نہیں دیکھا، جو بڑے بڑے عقلمند پر غالب آجاتے ہوں، اس عورت نے عرض کیا یارسول اللہ عقل و دین کا وہ نقصان کیا ہے۔؟ آپ نے فرمایا کہ عقل کا نقصان یہ ہے کہ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہے تو یہی تو عقل کا نقصان ہے اور ان راتوں کو نماز میں پڑھتے ہوئے تم ٹھہرتے ہو اور رمضان میں روزہ افطار کر دیتے ہو تو یہ دین کا نقصان ہے۔

یہ روایت بتاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسمیں صرف عورتوں سے خطاب فرمایا تھا اور انہی کے سامنے علوم و معارف کے خزانے رکھے ہیں، جو اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ عورتوں کے لئے بھی علم کا حصول ایک دینی فریضہ ہے، یہی وجہ ہے کہ عورتوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی علمی تشنگی اور دینی معلومات حاصل کرنے کا شوق والہانہ انداز میں ظاہر کیا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حاصل سیر جواب بھی بتاتا ہے کہ نوع انسانی کی اس نازک جنس کو بھی علم سے محروم نہ رکھا جائے۔ بلکہ ان کے لئے ہر ممکن وسائل علم و حکمت فراہم کئے جائیں، امام نووی نے حدیث مذکور سے مسائل کا استنباط کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے۔

"وفیہ مراجعہ المتعلم العالم، والتابع المتبوع فیما قال لہ اذا لم یظہر لہ معناہ کمراجعہ ھذہ الجزلہ۔ (۲)

اسکی ایک اور عمدہ مثال دی جاسکتی ہے جسکو ابن اثیر نے اسد الغابہ میں اسماء بنت یزید کی حالات میں لکھا ہے کہ ایک دن حضرت اسماء حضور اقدس صلی اللہ علیہ و سلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے، حضرت اسماء عرض کرتی ہیں یارسول اللہ۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں عورتوں کا ایک وفد لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں، بلاشبہ اللہ تعالی نے آپ کو مردوں اور عورتوں سبھوں کے لئے رسول بناکر بھیجا ہے، ہم نے آپ پر اور آپ کے معبود پر ایمان لایا ہے، ہم عورتیں گھروں میں محصور رہنے والی، لوگوں کی خواہشات پوری کرنے والی اور انکی اولاد کا بوجھ اٹھانے والی ہیں، پھر مردوں سے مخاطب ہوکر کہا اے لوگو! تمہیں ہم عورتوں پر جماعت میں حاضر ہونے۔ مریضوں کی عیادت کرنے، جنازے میں شرکت کرنے، حج کے بعد دوبارہ حج کرنے اور جہاد میں حصہ لینے کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے، تم جب عمرہ یا حج کے لئے یا اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے نکلتے ہو تو ہم تمہاری مال و دولت کی حفاظت اور آل اولاد کی تربیت کرتے ہیں اور کپڑے بنتے ہیں تو پھر کیا ہم تمہارے ساتھ اس اجر وثواب میں شریک نہیں ہوں گے؟ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ اے خاتون! ذرا معاملہ کو سمجھو اور جو عورتیں یہاں نہیں ہیں، انہیں بھی سمجھا دو کہ شوہر کے ساتھ تمہارا اچھی طرح سے رہنا سہنا، اسکی مرضی کے مطابق چلنا اور اسکے حکم کو بجالانا انکے تمام فضائل کے برابر ہے، راوی کا بیان ہے کہ حضرت اسماء اسکے بعد خوش خوش واپس ہوگئیں۔(۵)

یہ واقعہ بھی بتارہا ہے کہ عورتوں کا عالم وقت کے پاس جانا، ان سے دینی مسائل کی تحقیق اور معلومات فراہم کرنا اور دوسری عورتوں تک ان علوم و معارف کا پہونچانا ایک اہم دینی فریضہ ہے۔

علوم و فنون میں عورتوں کی توجہ اور ان کا کردار

یہی وہ فریضہ تھا جسکی وجہ سے ابتدائے اسلام ہی سے عورتیں حصول علم کی طرف متوجہ ہوئیں، اور یہ انکی سہل طبیعت، حسن استعداد، دین سے محبت اور ایمان میں پختگی کے عین مطابق تھی، جس بناء پر انہوں نے اس میدان میں غیر معمولی اہم رول ادا کیا ہے، جس کی عمدہ مثالیں امہات المومنین میں دیکھی جاسکتی ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ جن سے دو ہزار دو سو دس حدیثیں مروی ہیں، انکے بارے میں در منثور کی مصنفہ بیان کرتی ہے۔

انہا افصح اہل زمانہا و احفظہم للحدیث روی عنہا الرواہ من الرجال و النساء(۶)

وہ اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ فصیح اللسان خاتون تھیں اور سب سے زیادہ روایتیں بیان کرنے والی تھیں، جن سے مرد و عورت سبھوں نے روایتیں لی ہیں

حضرت عطا بن رباء انکے بارے میں فرماتے ہیں "کانت عائشہ من افقہ الناس واحسن الناس رایا (۳)

اکابر صحابہ بھی آپ سے علم فرائض کے پیچیدہ مسائل دریافت کیا کرتے تھے، حضرت مسروق فرماتے ہیں کہ علم فرائض کا علم سب سے زیادہ حضرت عائشہ صدیقہ کو تھا(۸) حضرت عروہ فرماتے ہیں۔

" مارائیت احدا اعلم بفقہ ولا بطب ولابشعر من عائشہ رض (۴)

صحابیات میں اسی طرح ایک ایسی بڑی تعداد ہے جو علم و فضل میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ یہ تو اس دور کی بات تھی جبکہ مسلمان اپنی تعداد اور قوت کے اعتبار سے محدود دائرہ میں تھے۔ لیکن جب اسلامی حکومت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا، اسلامی فتوحات دن بدن بڑھنے لگے، دنیا کے بہت سے ممالک اسلام کے زیر نگیں ہونے لگے اور مسلمانوں کے علوم، فنون کا دائرہ بہت وسیع ہوتا چلا گیا، تو عورتوں نے بھی علوم و فنون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اکثر میدان میں بڑا مقام حاصل کیا جسکی مثالیں اسلامی تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

فن حدیث میں عورتوں کا مقام

فن حدیث میں عورتوں نے جس مہارت غیر معمولی صلاحیت اور جفاکشی کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے، اور جتنی بڑی تعداد میں ان کا گروہ نظر آتا ہے وہ اس امت کے لئے ایک بڑا امتیاز ہے چنانچہ امام ذہبی نے اپنی کتاب میں جن فرزانہ خواتین کا ذکر کیا ہے، ان میں سے چند بطور مثال پیش کئے جاتے
ہیں۔ کریمہ بنت احمد مرزویہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان سے سو احادیث مروی ہیں، فاطمہ بنت عبداللہ کی سو روایات کے علاوہ ایک مسند بھی ہے جو مسندۃ اصبھان۔ سے مشہور ہے، فخر النساء شھدہ بنت ابری کی مسند ہے، جو مسندہ العراق الکتابیہ۔ سے مشہور ہے، شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کی پوتی زینب بنت یحیٰ کی مسند روایتیں تو بہت زیادہ ہیں، زینب بنت الکمال تو مسندہ الوقت سے مشہور تھیں، یہ کوئی معمولی لقب نہ تھا کیونکہ مسند کا لقب انہی کو ملتا تھا جن کے اندر ضبط اور روایت کی شرطیں کمال درجہ کی پائی جاتی ہوں، انکے علاوہ اور بھی خدا کی بندیاں ہیں۔ جنہوں نے فن حدیث میں بڑا کمال پیدا کیا، (۱۰) درمنثور کی مصنفہ نے ایک بہت ہی فرزانہ خاتون زینب بنت محمد بن عثمان الدمشقیہ کے بارے میں لکھا ہے۔

" انھا کانت من احسن نساء زمانھا منظرا واعذ بھن مقالا وافصحھن منطقا واعلمھن بالفقہ والحدیث (۵)

وہ اپنے زمانے میں حسن و جمال میں سب سے زیادہ تھیں ان کی گفتگو سب سے زیادہ شیریں ہوتی تھیں، ان کا کلام سب سے زیادہ فصیح تھا اور فقہ و حدیث میں تمام عورتوں سے فائق تھیں۔

مصنفہ موصوفہ ان کی تدریس اور افادہ کے بارے میں تحریر فرماتی ہیں۔

" وکانت حلقۃ درسھا لا تقل عن الخمسین طالبا للحدیث ولم یسمع بامراہ مثلھا فتحت حلقۃ الدرس، واجتمع فیھا طلاب مثل حلقۃ درسھا۔ (۶)

ان کا حلقہ درس بہت ہی وسیع تھا، طلبہ حدیث کی تعداد کبھی پچاس سے کم نہیں ہوئی ان سے زیادہ وسیع حلقہ درس کسی عورت کا نہیں دیکھا گیا اور نہ کسی عورت کے حلقے میں اتنا بڑا مجمع نظر آتا تھا۔

فقہ وحدیث میں ان کے چند رسائل تھے، جن کے بارے میں در منثور کی مصنفہ نے تذکرہ کیا ہے۔

ولھا رسائل فی الفقہ والحدیث استند علیھا کثیر من العلماء(۷)

فقہ وحدیث میں ان چند رسائل تھے جن پر بہت سے علماء نے اعتماد کیا ہے۔

دوسرے علوم وفنون میں عورتوں کا کمال

عورتوں نے اپنا کمال صرف علم حدیث ہی میں نہیں دکھایا بلکہ فقہ، نحو صرف بیان معانی، عروض وبلاغت میں بھی اپنا جوہر دکھایا ہے، در منثور کی مصنفہ نے ان میں سے چند کا ذکر کیا ہے، ان میں ایک خاتون عائشہ بنت علی بن محمد کے بارے میں لکھا ہے۔

وہ عالم بھی تھی اور عاملہ بھی، انہوں نے علم نحو میں بیان بھی بڑھا، اور عروض حدیث بھی

انکے علوم وفنون میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ بڑی تعداد میں عوام وخواص انکے علوم ومعارف سے مستفید ہورہے تھے، اور باضابطہ ان کا حلقہ درس لگا رہتا تھا، مصنفہ موصوفہ لکھتی ہیں۔

واقامت للتدریس سمعت من زوجھا الحافظ نجم الدین الحسنی وعن الامام الخباز وغیرھم وانتفع الناس بمعارفھا وعلومھا حتی انھا فاقت علی اھل زمانھا۔(۸)

انہوں نے حلقہ درس بھی لگایا تھا، اور اپنے شوہر حافظ نجم الدین حسنی، امام خباز اور انکے علاوہ دوسرے حضرات سے انہوں نے روایت کی اور انکے درس میں عوام وخواص انکے علوم ومعارف سے فائدہ اٹھارہے تھے، یہاں تک کہ وہ اپنے معاصرین میں سب پر فوقیت لے گئیں۔

اسی طرح عائشہ بنت یوسف بن احمد بن نصر کو فن نحو، فقہ اور عروض میں پوری مہارت حاصل تھی، اور بڑے بڑے علماء ان سے استفادہ کیا کرتے تھے اور طلبہ کی بڑی جماعت کا ہجوم رہتا تھا، مدائح نبوی میں ایک دیوان بھی ہے، اس کے علاوہ چند کتابیں بھی ہیں، جو بہت ہی مفید اور مشہور ہیں، انکی اہم تصنیفات میں ایک اہم تصنیف "مولد جلیل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جو نظم ونثر دونوں پر مشتمل ہے، اسکے علاوہ دوسرے مضامین، قصائد اور کتابیں بھی ہیں۔

ادب اور شعروشاعری میں عورتوں کا اعلیٰ ذوق

دوسرے علوم وفنون کی طرح ادب اور شعروشاعری میں بھی انہوں نے اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیا ہے اور یہ زمانہ قدیم کی عورتوں کا امتیاز تھا کہ علم وفن کے آفتاب ومہتاب ہونے کے

ساتھ ساتھ ادب اور شعر و شاعری میں بھی یگانہ روزگار ہوا کرتی تھیں، چنانچہ سیدہ سکینہ بنت حسین بھی انہی ممتاز اور یگانہ روزگار خاتون میں تھیں ابن خلکان انکے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

کانت سیدہ نساء عصرھا و اجملھن و اظرفھن و احسنھن اخلاقا ولھا نوادر و واقعات ظریفہ مع الشعراء و غیرھم (۹)

حضرت سکینہ اپنے زمانہ کی عورتوں کی سردار تھیں، سب سے زیادہ حسین اور ظریف تھیں، اور اخلاق و عادات میں سب پر فائق و برتر تھیں۔ اور شعراء کے ساتھ ان کے علاوہ دوسروں کے ساتھ عجیب و غریب پر لطف اور عمدہ واقعات بھی ہیں۔

حضرت خنساء جو بہت بڑی شاعرہ تھیں، انکے اشعار آج بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں، اپنے بھائی کی موت پر انہوں نے جو اشعار کہے ہیں، وہ اسلامی ادب کی تاریخ کا ایک نمایاں حصہ ہے، یاقوت حموی نے معجم الادباء میں ایک اور ذی وجاہت خاتون حفصہ بنت الحاج الرکونی کا بڑی خوبی کے ساتھ تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"انھا شاعرہ ادیبہ من اھل غرناطہ ذات حسب و ادب و جمال و مال، جیدہ البدیہ رقیقہ الشعر، استاذہ و لیت تعلیم النساء فی دار المنصور امیر المومنین۔ (۱۰)

حفصہ بنت الحاج امرکونی، غرناطہ کی ایک شاعرہ اور ادیبہ تھی، ذی وجاہت اور سلیقہ مند تھی، حسن و جمال کا پیکر اور برجستہ اور لطیف اشعار کہنے والی تھی، امیر المومنین منصور کے گھر میں عورتوں کی تعلیم و تربیت پر مامور تھی۔

عائشہ بنت احمد القرطبیہ کے بارے میں ابن حبان کا قول ہے

لم یکن فی زمانھا من حرائر اندلس من یعادلھا علما و فھما و ادبا و فصاحہ و شعرا۔ (۱۱)

اندلس میں علم و فہم اور ادب و شعر و شاعری میں عائشہ بنت احمد کے ہم پلہ کوئی اس زمانہ میں نہیں تھی۔

فن کتابت اور خوش خطی میں عورتوں کی مہارت

بعض عورتوں نے حسن خط اور فن کتابت میں بڑی مہارت حاصل کی ہیں، اور یہ قدیم زمانہ میں بڑی اہم چیز اور بڑا اہم فن سمجھا جاتا تھا، جس کے اصول و قواعد اور باضابطہ اساتذہ فن ہوتے تھے، وہ عورتیں جنہوں نے اس فن میں مہارت پیدا کیں، ان کا تفصیلی تذکرہ یاقوت حموی نے اپنی مشہور کتاب معجم الادباء میں کیا ہے، ان میں سے ایک خاتون ام الفضل بنت الحسن بن علی العطار (۸۰۰ھ) ہیں جو خوشخطی میں بہت ہی مشہور و معروف تھی، انکے بارے میں موصوف لکھتے ہیں

"وکانت تکتب علی طریقہ ابن البواب الذی ھذب طریقتہ، ابن مقلہ فتفوق علیہ وکتب الناس علی طریقہ ام الفضل۔ (۱۲)

وہ ابن البواب کے طریقہ پر کتابت کیا کرتی تھی، وہ ابن البواب جس کے طریقہ اور طرز کو ابن المقلہ نے مہذب و مرتب کیا، جس میں وہ فوقیت لے گئے اور لوگوں نے بھی ام الفضل کے طریقہ کو اختیار کیا۔

خوشخطی میں مہارت حاصل کرنے والی عورتوں میں ایک اور ممتاز خاتون ہیں جن کا تذکرہ درمنثور کے مصنفہ نے کیا ہے، وہ ہیں عائشہ بنت احمد القرطبیہ، مصنفہ موصوفہ انکے بارے میں تحریر فرماتی ہیں۔

(۱۳)

وکانت حسنۃ الخط تکتب المصاحف قال عنھا صاحب المغرب، انھا من عجائب زمانھا وغرائب اوانھا۔

عائشہ بنت احمد القرطبیہ بہترین کتابت کرنے والی تھی، اور صحیفوں کو لکھتی رہتی تھی، انکے بارے میں صاحب مغرب نے کہا ہے کہ وہ عجوبۂ زمانہ اور یگانۂ روزگار تھی۔

غرض کہ اللہ تعالی نے عورتوں کے اندر جو فطری صلاحیتیں اور طبعی قوتیں دی ہیں، اسلام نے انہیں ان صلاحیتوں اور قوتوں کو استعمال کرنے اور ان کو اجاگر کرنے سے نہیں روکا ہے، بلکہ اگر وہ دین اور خدمت خلق میں صرف ہو تو اسلام نے اسکی دعوت بھی دی ہے اور اسے دینی فریضہ قرار دیکر اجر و ثواب کا مستحق بنایا ہے، جسکی بناء پر ابتدائے اسلام ہی سے اسلام کی فرزانہ خواتین نے اس پر پوری توجہ دی اور دنیا کے اندر حیرت انگیز مثالیں پیش کیں جسکی ایک جھلک مذکورہ سطور میں دکھائی گئی ہے، توجہ دینے والوں کے لئے اتنا بھی کافی ہے ویسے وہ اسلامی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق الٹا سکتے ہیں۔

وماتوفیقی الا باللہ

****

حواشی وحوالہ جات

(۱) ابن ماجہ باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم جلد اول۔ (۲) مرقاۃ ج ۱ ص ۳۳۳،

(۳) مسلم شریف باب بیان نقصان الایمان بنقص الطاعات جلد اول

(۴) شرح مسلم للامام نووی باب نقصان الایمان بنقص الطاعات ۱\۶۰ (۵) اسد الغابہ ج ۷\ ص ۱۹،

(۶) الدر المنثور طبقات ربات الخدور\ ص ۲۸۰، (۷) ایضاً

(۸) اعلام الموقعین لابن قیم جوزی ص ۱۳\ ج ۱، (۹) الدر المنثور ص ۲۸۰

(۱۰) دول الاسلام للذھبی ج ۸ ص ۲۸ (۱۱) الدر المنثور ص ۳۴

(۱۲) ایضاً (۱۳) ایضاً ص ۳۴

(۱۴) ایضاً (۱۵) وفیات الاعیان ج ۲\ ص ۳۴۳،

(۱۶) معجم الادباء ج ۱۰\ ص ۳۴۰ (۱۷) الدر المنثور ص ۳۴

(۱۸) معجم الادباء ج ۱۶\ ص ۱۷۲، (۱۹) در منثور ص ۳۴

قاضی شریک نخعیؒ

مولانا محمد عباس قاسمی، استاذ دارالعلوم سبیل السلام

شاہی حکومت کے زیر سایہ قضا کے کام میں عدل وانصاف کی ڈگر پر قائم رہنا آسان نہیں، اہل سیر نے لکھا ہے کہ ایک فاضل قاضی نے اپنا یہ معمول بنا رکھا تھا کہ مجلس قضا کے انعقاد سے پہلے دوپہر کا کھانا کھاتے، موزے سے ایک کاغذ نکال کر اسے بغور دیکھتے پھر مقدمات کی سماعت کرتے لوگوں کو تجسس ہوا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ کسی طرح یہ تحریر دیکھی گئی لکھا تھا، اذکر الصراط وحدتہ، اذکر الموقف بین یدی اللہ عزوجل۔ (۱) (پل صراط اور اس کی باریکی اور خدا کے سامنے کھڑے ہونے کو یاد رکھو) یہ متورع، محتاط اور امور قضا میں حساس شخصیت قاضی شریک نخعی کی تھی۔

نام ونسب

ابو عبد اللہ کنیت، شریک نام، نسب شریک بن عبد اللہ بن ابی شریک حارث بن اوس بن الحارث بن الاذہل بن وہبیل بن سعد بن مالک بن نخع نخعی ہے (۲) قبیلہ نخع (یمن کا ایک بڑا قبیلہ جو مدحج کی شاخ ہے) کی طرف منسوب ہونے کے باعث نخعی کہلاتے ہیں۔ (۳)

پیدائش وسکونت

آپ کی پیدائش خراسان کے مشہور شہر بخاریٰ میں ۹۵ھ میں ہوئی "کان شریک ولد بنجاری من ارض خراسان۔" (۴) مگر بعض خاص، حالات کے پیش نظر آپ کا قبیلہ یمن سے کوفہ منتقل ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے قاضی صاحب بھی تاحیات کوفہ ہی میں مقیم رہے، یہی وجہ ہے کہ آپ جہاں نخعی کے نام سے مشہور ہیں وہیں ابو عبد اللہ کوفی سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں (۵) امام ابراہیم نخعی جو مشہور تابعی ہیں اسی خاندان کے چشم چراغ ہیں۔

اساتذہ

کسی کے علمی مقام کا اندازہ ان کے اساتذہ وتلامذہ سے کیا جاسکتا ہے اور یقیناً باصلاحیت وباکمال اساتذہ سے شرف تلمذ کسی شخص کی علمی جلالت شان کا ضامن ہوتا ہے، آپ کو اپنے زمانہ کے اکثر بلند پایہ اساتذہ حدیث وفقہ سے استفادہ کا شرف حاصل ہے، چند قابل ذکر نام یہ ہیں

ابو اسحاق سبیعی، ابراہیم بن جریر البجلی، اسماعیل بن ابی خالد، راشد بن کیسان، عاصم بن سلیمان احول، سماک بن حرب، اعمش ومنصور وزید الیامی، عاصم بن بھدلہ، عاصم بن کلیب، ہشام بن عروہ، عطاء بن سائب، وکیع ویحیٰ بن آدم، ابو اسامہ، حسین بن محمد المروزی، حجاج بن محمد، اسحاق ابو عیسیٰ بن طباع، حاتم بن اسماعیل، یعقوب بن ابراہیم بن سعد، زید بن ہارون، ابو نعیم وابو غسان

،علی بن حجر، محمد بن طفیل نخعی، قتیبہ بن سعید، محمد بن سلیمان (٦)۔

علو شان اور علمی مقام

قاضی شریک اپنے کمال علم، زہد و تقویٰ، خاندانی شرافت، ذہانت وفطانت اور فن حدیث میں مہارت کے اعتبار سے عوام بالخصوص علمی حلقوں میں بہت ہی مقبول و مشہور تھے، امراء و سلاطین عقیدت واحترام میں جبین نیاز خم کرتے، اہل علم آپ کے علمی کمالات اور فطری صلاحیت کے معترف تھے، ابن عینہ کا قول ہے: "کان احضر الناس جواباً۔ (٧) آپ بہت حاضر جواب تھے -----ان کا ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے آپ سے دریافت کیا، کہ آپ کی اس شخص کے بارے میں کیا رائے ہے؟ کہ جس نے نماز فجر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھنے کا ارادہ کیا پھر اس نے رکوع کے بعد پڑھا، آپ نے برجستہ جواب دیا کہ پہلے اس نے غلطی کرنی چاہے مگر وہ اس سے بچ رہا (فیمن اراد ان تقنت فی الصبح قبل الرکوع فقنت بعدہ فقال ھذا اراد ان یخطی فاصاب، (٨) ابو جعفر طبری آپ کے عالم فقیہ ہونے کا اعتراف کرتے ہیں۔ (قال ابو جعفر طبری کان فقیہا عالما،٩) معاویہ بن صالح نے امام احمد بن حنبل سے آپ کے بارے میں دریافت کیا تو امام صاحب نے فرمایا، (کان عاقلا صدوقا محدثا شدید اعلی اھل الریب والبدع ،١٠) آپ عاقل، صداقت پسند، محدث اور اہل بدعت وریب کے بارے میں سخت تھے۔

حدیث

فن حدیث میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند تھا، ابن مبارک کا قول ہے کہ آپ سفیان ثوری سے زیادہ کوفیوں کی حدیث سے واقف تھے۔(قال ابن مبارک شریک اعلم بحدیث الکوفیین من الثوری، (١١) اکثر علماء نے آپ کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے، معاویہ بن صالح کی رائے ہے کہ شریک صدوق وثقہ ہیں۔ (قال معاویۃ بن صالح عن ابن معین شریک صدوق ثقۃ،١٢) عجلی ثقہ اور حسن الحدیث ہونے کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں۔ (قال العجلی کوفی ثقۃ وکان حسن الحدیث (١٣،

مگر بعض حضرات نے ثقاہت کے ساتھ سوء حفظ کی بھی شکایت کی ہے۔ (قال یعقوب بن شیبہ شریک صدوق ثقۃ سئی الحفظ جدا (١٤) قاضی شریک صدوق وثقہ کے ساتھ بہت کمزور حافظہ کے آدمی ہیں، چنانچہ بعض حضرات نے اسی وجہ سے ان کی روایات کو قابل قبول نہیں مانا ہے۔ ابراھیم بن سعید جوہری نے کہا ہے کہ انہوں نے چار سو روایتوں میں غلطی کی ہے۔ (قال ابراھیم بن سعید الجوہری اخطاء فی اربعمائۃ حدیث ،١٥) جوز جانی کا قول ہے (شریک سئی الحفظ مضطرب الحدیث

مائل،١٦) لیکن جن حضرات نے ان کے سوء حفظ کو بنیاد بنا کر ان کی مرویات پر مطلقاً غیر معتبر ہونے کا حکم لگایا ہے محققین کے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے، کیونکہ سوء حفظ کا عارضہ آپ کو پوری زندگی نہیں رہا بلکہ یہ شکایت صرف اخیر زندگی ہی میں رہی، وہ بھی قضا کی اہم ذمہ داریوں نے آپ کے قوت حافظہ کو متاثر کر دیا تھا، پس ابتدائی دور کی روایتیں غلط واشتباہ سے محفوظ اور معتبر ہیں، ابن حبان اس سلسلہ میں خود معترف ہیں (وکان فی آخر امرہ یخطئی فیما روی تغیر علیہ حفظہ

فسماع المتقد مین منه لیس فیه تخلیط و سماع المتاخرین منه بالکوفه فیه اوهام کثیره ،۱۷) اسلئے ابتدائی زندگی میں آپ سے جن راویوں نے روایات لی ہیں وہ قابل قبول ہیں، وہ روایات جو متاخرین حضرات نے آپ سے کوفہ میں سنی ہیں ان میں خلط واقع ہوا ہے ۔ عجلی کا بیان ہے ۔(من سمع منه قدیما وحدیثه صحیح ومن سمع منه بعد ماولی القضا ففی سماعه بعض الاختلاط ،۱۸) جس نے شروع میں ان سے سماع کیا وہ روایات درست ہیں اور جس نے ان کے قاضی ہونے کے بعد سماعت کی ان روایات میں کچھ اختلاط ہے ۔

فقہ

آپ میں فراست اور فقہی بصیرت کمال درجہ کی تھی ، یہی وجہ ہے کہ مختلف شہروں میں مسند عدل وقضا پر فائز رہے ، اہل علم اور ارباب اقتدار حتی کہ امیر المومنین آپ کے علوم وفنون سے مستفید ہوتے رہے ----- ایک موقع پر خلیفہ مہدی اورنگ نے آپ سے دریافت کیا کہ ایسے شخص کے بارے میں کیا رائے ہے ؟ کہ کسی نے اس کو کسی مخصوص چیز کے لانے کا وکیل بنایا مگر وہ اس شئی کے علاوہ کوئی دوسری چیز لے آیا ، پھر وہ ضائع ہو گئی ، قاضی صاحب نے فرمایا کہ اے امیر المومنین وہ اس کا ضامن ہوگا (ماتقول فی رجل امر وکیلا له ان یاتی لشی بعینه فاتی بغیره فتلف ذلک الشی فقال یضمن یاامیر المومنین ،۱۹) ۔

ایک مرتبہ یحیٰ بن عبداللہ حسن بصری اور قاضی شریک رشید کے مکان میں تھے ، یحیٰ نے قاضی صاحب سے پوچھا کہ نبیذ کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے ؟ آپ نے فرمایا: حلال ، پھر کہا اس کا پینا بہتر ہے یا چھوڑنا ؟ آپ نے کہا پینا ، پھر پوچھا کہ اس کا کم پینا بہتر ہے یا زیادہ : کہا کہ کم ، تو یحیٰ بن عبداللہ نے کہا کہ جتنی چیزیں خیر کی ہیں ، ان میں کثرت ہی بہتر ہے ، سوائے تمہاری اس چیز کے ، کہ اس کی کم مقدار ، زیادہ مقدار سے بہتر ہے ، (مارایت خیراقط الاوالازدیاد منه خیر الاخیرک هذا ، فان قلیله خیر من کثیر ،۲۰)

قضا

گو آپ میں فن فقہ سے غیر معمولی مناسبت ولگاوہ کی بنا پر قضا کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی ، مگر ہمیشہ اس اہم منصب سے اپنی وابستگی کو آزمائش وابتلاء ہی تصور کرتے تھے ، کیونکہ یہی وہ اہم اور نازک ترین مقام ہے جہاں عالی مرتبت شخصیات کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں ، چنانچہ کبھی اپنے آپ کو نااہل بتا کر عذر کرتے رہے (انما انظر فی الصلوه والصوم فاما القضاء فلا احسنه) اور کبھی اس کو آڑ بناتے ہوئے اپنے آپ کو دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ۔ (الاکله اخفیها علی نفسی ،۲۱) مگر علم وفضل اور ذکاوت وفراست کی وجہ فرمانروائے وقت کی طرف سے بہ اصرار عہدہ قضا تفویض ہوا اور ۱۵۳ھ میں کوفہ کے مسند قضا پر فائز ہوئے ، لیکن ابن حبان نے پہلے واسط کے قضی ہونے کا ذکر کیا ہے : (قال ابن حبان فی الثقات ولی القضا لواسط بسنته ۵۵ ، (۲۲)

قضا کے معاملہ میں ، بہت ہی محتاط ، غیر جانبدار رہے اور پوری زندگی عدل وانصاف کے ساتھ بسر کی ، حاکم وقت کے خلاف کوئی فیصلہ کرنے میں بھی تامل نہیں ہوا ، اس سلسلہ میں ان کا ایک دلچسپ اور اہم واقعہ ہے ----- ایک موقع پر آپ نے حاکم کوفہ کے ایک ، کاتب کے خلاف

(باقی برص ۷۱)

ایک اشتراکی شاعر کا خواب اور اس کا جواب

نیچے ایک اشتراکی شاعر کا خواب اور ایک مسلمان شاعر کی طرف سے اس کے جواب سے ناظرین محظوظ ہونگے۔۔۔ یہ دونوں نظمیں (جو غیر مطبوعہ ہے) ایک عرصہ پہلے کی ہے۔ اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اشتراکیت کے خواب پریشاں کے سارے تاروپود اب واقعات کی دنیا میں بکھر چکے ہے اور اس کے مولد ہی میں اس کا مرقد تیار ہو رہا ہے۔ (ادارہ)

ہم جیسے قلمکاروں کے خواب
کتنے دلاویز وفرحت خیز ہیں
یہ تبسم ریز خواب
جن کو پالا ہے ہماری فکر فن کے پیار نے
خوں سے لکھے ہوئے اقرار نے۔

یہ جہاد زیست
یہ جذب درون صف شکن
یہ وفور شوق
یہ حیرانئی دار ورسن
یہ عزائم
یہ مچلتے ولولے
ان ہی خوابوں کی عطا کردہ ہے جینے کی لگن
یہ جنون، یہ بانکپن
ان ہی خوابوں سے عبارت ہے ہماری زندگی
یہ نہ ہوتے تو فنا کی ظلمت پر ہول میں
کھو گیا ہوتا
ارتقا کے رازدانو کا وجود
عظمت شعر ادب کے پاسبانوں کا وجود
ہم نے مانا

بل پہ بل کھاتی صبا
شوخ شبنم کی پھوار
ناز فرماتی ہوئی کلیاں قطار اندر قطار
جھومتے لمحات کے ہاتھوں میں ساز کیف وکم
گنگناتے آبشار
چارسو رقص بہار
بخش دیے ہیں نگاہ شوق کو
جب حقیقت میں بدل جاتے ہیں یہ پر کیف خواب
اور پھر
صدیوں کی نالہ کش حیات
جھوم اٹھتی ہے غم ایام سے پا کر نجات
کتنے دلاویز وفرحت خیز ہیں
یہ تبسم ریز خواب
خواب......

****

شمیم پھلواری

جواب

تم جیسے سیہ کاروں کے خواب
خام دل، فاسد نظر، بے مغز فرزانوں کے خواب
کتنے شر آمیز و وحشت خیز ہیں
یہ تعفن بیز خواب
جن کو پالا ہے تمہارے نفس ناہنجار نے
بدنگاہ و جرم خو کردار
نے

یہ
فسادِ ارض یہ قتل سہی
سروسمن یہ عروج ظلم
یہ بربادئ رنگ چمن
یہ بہائم
یہ اُچھلتے اژدہے
ان ہی خوابوں نے کیا تاراج پھولوں کا پھبن
مسموم جیون کا پون
یہ خاک و خوں، یہ رہزنی
یہ ستم، یہ بے کسی
ان ہی ظلمت سازیوں کو کہہ رہے ہو روشنی
دہشت و کرب والم کا نام ہے کیا زندگی؟

یہ نہ ہوتے توا.م کی سمت پہلے ہی بہت
کر گیا ہوتا
تمہارے بخت کا اختر صعود

کج کلاہان ستم ہر دور میں
چھینتے آئے ہمارے ہاتھ سے لوحِ قلم
گھونٹتے آئے گلہ نغمات
کا خامئہ صدق و صفا کے ضوفگن رشحات کا
ہاں مگر
جن کی نگہبانی پہ ہے مامور
تابندہ شعور
وہ سنہرے خواب
ان کی دسترس سے دور ہیں
تم جہانِ نو سے نظریں پھیر کر
طنز کرتے ہو ہمارے خواب پر
تم ہمارے خواب کے اعجاز سے واقف نہیں
سن سکو تو لو سنو
ہم سے سنو
الجزائر کے بہادر نوجوانوں کی قسم
کوریا کے کام گاروں اور کسانوں کی قسم
رفعت کیوبا کے ہیکل پاسبانوں کی قسم
ویٹ نامی سرفروشوں کی مقدس داستانوں کی قسم
ارض گیتی کے کسی بھی خطہ پامال پر
جب سسکتی ہے حیات
مل نہیں پاتی نجات
جبر واستبداد کے بیہودہ ننگے ناچ سے
اٹھتے بن کر بکھر جاتے ہیں یہ پروردہ خواب

اور پھر
بپھرے ہوئے انسان کی یلغار سے
اک وخون میں
لوٹنے لگتے ہیں ظالم بھیڑیے
یاد رکھو
ریگ زار زندگی میں

رہزن امن و
سکوں کے ناشناسوں کا جمود
تم ہی
بولو کیا نہیں ہو ابن ہٹلر جور میں
کیا تمہاری روح کو نسبت نہیں چنگیز سے
تم نے ڈھائے کس قدر انسان پر ظلم وستم
چوس ڈالا ہے لہو جذبات کا
گھیر کے لائے ہو بادل جبر کی برسات کا

ہاں!
سنو جن کے قطروں میں بسا صد عالم کیف و سرور
عشرت کا وفور
وہ رسیلے جام
ہونٹوں سے تمہارے دور ہیں
ان کے درشن کو
تمہاری پتلیاں بے نور میں
تم حقائق سے نگاہیں پھیر کر
وار کرتے ہو ازل کے ساز پر
بیٹھ کر
ظلمت کدہ میں
سرنگوں
منھ چڑھاتے ہو فلک کے چاند کا
نازنیں ہاتھوں سے سنگ وخشت تم

پھینکتے ہو آہنی دیوار پر
اے تبدد کے اسیر!
تعبیر ہائے خواب سے کیا تم نہیں ہو آشنا
اس جہان رنگ وبو میں خواب نے کیا کیا کیا
ہو اگر تم نابلد
تو لو سنو

ہم سے سنو
کاشغر کے ظلم میں ڈوبے جیالوں کی قسم
ہنگری سے روس تک کے نونہالوں کی قسم
وادی سکیانگ کی پامالی غزالوں کی قسم
گلستاں زنچ سے اٹھتے شور نالوں کی قسم
جب کبھی ناٹک رچا عفریت خون آشام نے
تھر تھرائی کائنات
بلبلا اٹھی حیات
خواب
تم جیسے سیہ کاروں کے خواب

-----اور جہاں نو کے داعی!
اب بھی آنکھیں کھول
لو آدمیت کی کلہ پیروں تلے روندے ہوئے
اور نظام عقل ودل کو یک قلم القط کئے
جسکی رعنائی مسلم، جسکی برنائی سرور
جسکی گیرائی بلاشک جسکی گہرائی شعور
ہوش کے ناخن تو لو
کہ فکر میں آیا فتور
چاہتے ہو باغ کی ترتیب کس انداز سے
کیا محض زاغ وزغن کے گھونسلے آباد ہوں
کیا دھتوروں کیلئے مٹ جائیں یہ خوشتر گلاب

صفا

اف یہ منظر!!!
کائنات رنگ وبو پہ
چھا گئی گئی خونی گھٹا
جاں گسل چیخ و پکار
مچ گئی ہے ہاہا کار
صحن و شبنم اشکبار
اڑ گیا گلشن کے رخ سے بانکپن رنگت نکھا

بربط ایام ہیں محروم تار زیر و بم
کودتے ہیں مور و مار
سوکھتے ہیں مرغزار
بلبل و گل زار زار
جب سے دیکھے تم نے یہ بے درد اور خوں ریز خواب
واقعی تیر و سناں خنجر ہیں یہ بے ہودہ خواب
خواب
تم جیسے سیہ کاروں کے خواب۔

مولانا محمد مصطفیٰ مفتاحی

****

• بقیہ: قاضی شریک نخعی •

فیصلہ سنا کر اسے جیل بھیج دیا، حاکم نے اس رہا کر دیا، جب شیخ کو اس کا علم ہوا تو سخت نوٹس لیا اور اپنی خفگی اس انداز میں ظاہر کی کہ آپ کو اس سلسلہ میں تو میرا تعاون کرنا چاہئے نہ کہ شرعی نقطہ نظر سے فیصلہ کئے ہونے کی مخالفت، اگر اسے دوبارہ قید خانہ نہیں بھیجا تو پھر امیر المومنین کے سامنے آپ کی اس غلط حرکت کو ظاہر کرونگا چنانچہ انہوں نے فوراً کاتب کو جیل واپس کر دیا۔

وفات

کوفہ میں بروز ہفتہ ۷ھ میں وفات پائی، لیکن خلیفہ بن خیاط کا گمان ہے کہ ۷۷ھ یا ۷۸ھ میں انتقال ہوا، اس موقع پر خلیفہ ہارون الرشید مقام حیرہ میں تھے، آپ کی نماز جنازہ میں شرکت کی غرض سے تشریف لا رہے تھے مگر انہیں راستے میں خبر ملی کہ نماز ہو چکی ہے، تو پھر واپس تشریف لے گئے

توفی یوم السبت مستہل ذالقعدہ مسنتہ سبع و سبعین و ستہ باللوفہ، وقال خلیفہ بن خیاط امان مسنتہ سبع و ثمان و سبعین ماعنہ، رحمتہ اللہ تعالیٰ، و کان ہارون الرشید بالجیرہ، فقصدہ لیصلی علیہ فوجد ھم فصلوا علیہ ترجع (۲۳) ع

حواشی و حوالہ جات

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱ص ۱۵۱ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۴۶۴ (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) تہذیب التہذیب ص ۳۳۲ (۶) تہذیب التہذیب ص ۳۳۴ (۷) ایضاً ص ۳۰۶ (۸) ابن خلکان، ص ۴۶۸ (۹) تہذیب التہذیب ص ۳۳۲ (۱۰) ایضاً (۱۱) ایضاً ص ۳۳۵ (۱۲) ایضاً (۱۳) ص ۳۳ (۱۴) ایضاً (۱۵) ایضاً ص ۳۳۳ (۱۶) ایضاً (۱۷) ایضاً (۱۸) ایضاً (۱۹) ابن خلکان ص ۴۶۲ (۲۰) ابن خلکان ص ۴۶۲ (۲۱) ایضاً ص ۴۶۵ (۲۲) تہذیب التہذیب ص ۳۳۶ (۲۳) ابن خلکان ص ۴۶۸

ترتیب و تحشیہ: مولوی عبدالغنی قاسمی
تخصص فی الفقہ، دوم

فقہی مذاکرہ - ۲ر فروری ۱۹۸۸ء

سوال وجواب

گزشتہ تین سال سے مشہور دینی وملی کارکن جناب سید [illegible] الدین صاحب مشیر انکم ٹیکس کی خواہش پر ارم کالج، اعظم پورہ، حیدرآباد، کے ہفتہ واری اجتماع میں ہر انگریزی ماہ کے پہلے [illegible] کو "فقہی مذاکرہ" کی مجلس منعقد ہوتی ہے، جس میں کثیر تعداد میں نوجوان، تعلیم یافتہ، علماء اور عوام شریک ہوتے ہیں اور تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، اسلام پر ہونے والے شبہات اور ہر طرح کے مذہبی سوالات کرتے ہیں اور حضرت الاستاذ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب ان کے جوابات دیتے ہیں۔ ہر ماہ یہ جوابات ٹیپ کرلئے جاتے ہیں اور اہل ذوق واصحاب ضرورت حاصل کرتے ہیں۔ "صفا" کے اس شمارہ سے سوال وجواب کے کالم میں وقتاً فوقتاً یہ [illegible] بھی پیش کیا جاتا رہے گا۔ زیر نظر سوالات وجوابات ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے نقل کے گئے ہیں اور راقم سطور نے ان پر ذیلی عنوانات قائم کردئے ہیں اور حاشیہ پر بعض ضروری حوالہ جات کی تخریج کردی ہے۔

"عبدالغنی"

برزخ کی زندگی

موت کے بعد انسان کس طرح عذاب وثواب کا احساس کرتا ہے، خوش ہوتا ہے یا غمگین ہوتا ہے حالانکہ راحت وتکلیف اور خوشی وغم کا احساس زندگی کی خصوصیات میں سے ہے؟

روح اور جسم کے تعلق اور ربط کا نام حیات اور زندگی ہے، ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں لکھا ہے کہ روح اور جسم کے تعلق کی پانچ صورتیں ہیں اور ان کے الگ الگ احکام ہیں، اول وہ حالت جب جنین بطن مادر میں ہوتا ہے، دوسرے وہ حالت جب انسان اس دنیائے فانی میں وجود پذیر ہوتا ہے، تیسری نیند کی حالت، جب روح ایک حد تک جسم سے بے تعلق ہوتی ہے اور ایک حد تک متعلق بھی رہتی ہے چوتھی صورت حیات برزخی کی ہے، جس میں گو جسم اور روح میں اتصال باقی نہیں رہتا، لیکن تاہم ان میں باہم ربط اور ایک غیر مرئی رشتہ باقی رہتا ہے، ملا علی قاری کی زبان میں۔ "فانہما لم تفارقہ فراقا کلیا۔ (۱) اور پانچویں حالت آخرت کی ہے، جسم وروح کے باہمی ربط واتصال کا یہ مرحلہ سب سے زیادہ مکمل ہوتا ہے،۔یہی وجہ ہے کہ یہاں جسم پر نہ موت طاری ہوتی ہے نہ نیند آتی ہے اور جنت میں داخل ہوا تو نہ بیمار ہوتا ہے اور نہ جسم میں کسی طرح کا فساد پیدا ہوتا ہے

اس تفصیل سے حیات برزخی کی نوعیت کو سمجھا جاسکتا ہے، کہ انسانی جسم مٹی کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس کی روح اپنے مقام پر پہونچادی جاتی ہے، لیکن ان کے درمیان پھر بھی ایک رشتہ اور ارتباط باقی رہتا ہے۔ اسی ربط کی وجہ سے قبر میں عذاب وثواب کا احساس ہوتا ہے اور یہی محمل ہے ان روایات کا جن سے مردوں کا سلام سننا اور جوتوں کی آواز سننا معلوم ہوتا ہے ----- پہلے زمانہ میں اس کو سمجھانا مشکل تھا لیکن اب جدید ایجادات نے اس کا سمجھانا آسان کردیا ہے۔ اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ ریڈیو اسٹیشن اور ریڈیو، ٹیلی ویژن اسٹیشن اور ٹی وی کے درمیان کتنا فاصلہ ہوتا

ہے؟ بظاہر ان کے درمیان کوئی ربط نظر نہیں آتا، لیکن کچھ ان دیکھی اور غیر مرئی لہریں ہیں جو ان دونوں کو باہم جوڑتی ہیں، ایک جگہ کی آواز دوسری جگہ سنی اور ایک مقام کی صورت دوسرے مقام پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسلئے شرعاً تو عذاب قبر کا ثبوت ہے ہی عقلاً بھی عذاب قبر میں کوئی استبعاد اور استعجاب نہیں۔

کیا حضورؐ عالم الغیب تھے؟

مسلمانوں میں بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ حضور (ص) عالم الغیب تھے اس طرح کا عقیدہ رکھنا اھل سنت والجماعت کے نقطہ نظر سے کہاں تک جائز ہے۔؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب ہونے کی بحث ان مجلسوں میں بار بار آچکی ہے، اب ان کا اعادہ ضروری نہیں، البتہ اتنا عرض کرتا ہوں کہ کتاب اللہ میں تاویل کی اور احادیث میں توجیہہ و بحث کی گنجائش ہے، جو لوگ حضور (ص) کیلئے علم غیب ثابت کرتے ہیں وہ بھی مقلد ہیں، حنفی ہیں، ہم بھی مقلد ہیں اور حنفی ہیں، مقلدین کے لئے ان کے فقہی مذہب کی کتاب ہی مدار فتویٰ ہوتی ہے کیونکہ وہ کتاب و سنت کا نچوڑ ہوتی ہے، اسلئے ہمیں علماء احناف کی کتب فقہ و عقائد کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور اس کو حکم ماننا چاہئے، فقہ اکبر عقیدہ کی مشہور کتاب ہے، جو امام ابو حنیفہ کیطرف منسوب ہے۔ ملاعلی قاری نے اس کتاب کی شرح کی ہے۔ یہ خود بھی بہت بلند پایہ فقیہ ہیں اعلیٰ درجہ کے محدثین میں ان کا شمار ہے، متکلم بھی ہیں، وہ اسی شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں،

ثم اعلم ان الانبیاء لم یعلموا الغیبات من الاشیاء الا ما اعلیھم اللہ تعالیٰ احیانا وذکر الحنفیہ تصریحا بالتکفیر باعتقاد ان النبی (ص) بعلم الغیب م لمعارضتہ قولہ تعالیٰ قل لا یعلم من فی السموات والارض الغیب الا اللہ۔

یعنی انبیاء کو غیب کی باتوں کا علم نہیں سوائے ان باتوں کو جو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً بتا دیں، احناف نے صراحت کے ساتھ ان لوگوں کو کافر قرار دیا ہے جو اس بات کا عقیدہ رکھتے ہوں کہ آپ (ص) عالم الغیب ہیں، اسلئے کہ یہ عقیدہ قرآن مجید کی آیت قل لا یعلم الغیب کے مخالف ہے، اہل انصاف کیلئے ملاعلی قاری کی یہ عبارت خود چشم کشا ہے اور مزید تفصیل کی محتاج نہیں۔

تصرفِ ارواح

تصرف ارواح کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کیا ہے؟ معلوم فرمائیں، کیا اللہ تعالیٰ نے ارواح کو دنیا میں آنے، مدد کرنے اور شکلیں اختیار کرنے کا اختیار دیا ہے۔
بزرگوں کی روحیں کیا دنیا میں تصرف کرتی ہیں اور نفع و نقصان پہونچاتی ہیں؟

یہ ایسا سوال ہے جس کا تعلق عقیدہ سے ہے، اسلام کے تصور کا ترجمان ہے (ایاک نعبد وایاک نستعین) کہ ہم اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی سے مدد چاہتے ہیں، اس آیت میں اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ کوئی شخص غایب جو اس دنیا سے جا چکا ہو اور موجود نہ ہو وہ انسان کی مدد نہیں کر سکتا، صرف اللہ کی ذات ہی مدد کرنے والی ہے، کتب فقہ بھی اس سلسلہ میں، ہماری رہنمائی کرتی ہے، فقہاء نے لکھا ہے۔

ومنھا ان ظن ان المیت یتصرف فی الامور دون اللہ واعتقادہ ذلک کفر

کہ بدعات اور عقائد کفر میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ کے علاوہ مردوں کی روحیں تصرف کرتی ہیں، کوئی ایسا عقیدہ رکھے تو یہ کفر ہے، یہ ہمارے فقہاء کی بے غبار اور واضح عبارت ہے

قبر کا طواف

بعض علماء ربانی کشف القبور کے لئے قبر کے طواف کی اجازت دیتے ہیں کتاب وسنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

جہاں تک قبر کے طواف کی بات ہے تو بالکل جائز نہیں، دیکھئے دو چیزیں ہیں، ایک ہے عبادت اور دوسرے استغفار، ایسی چیزیں جن کا شمار عبادت میں ہوتا ہو، قبر پر بالکل جائز نہیں، اسی لئے قبر پر حضور (ص) نے مسجد بنانے سے منع کیا، قبر کو سجدہ کرنا جائز نہیں، قبر کی عبادت جائز نہیں، قبر کی طرف رخ کر کے دعا کرنے کو فقہاء نے منع کیا ہے قبر سے کوئی سوال کرنا جائز نہیں، اسلئے کہ ان تمام امور کا تعلق دراصل عبادت سے ہے، وہ اعمال قبر پر کئے جا سکتے ہیں جن کا تعلق استغفار سے ہے، یعنی صاحب قبر کیلئے دعاء مغفرت کرنا اور اللہ کے حضور عرض کرنا کہ وہ اس کے گناہوں کو معاف کر دیں، اسی لئے موت کے بعد نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے، اور قبر پر دعاء استغفار کی جا سکتی ہے۔

یاد رکھئے! طواف استغفار نہیں عبادت ہے اسی لئے خانہ کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے، خانہ کعبہ کے سوا کسی اور مقام کا طواف جائز نہیں اور اس کو علماء نے بدعت لکھا ہے، اب تو اس کا رواج نہیں ہے، پہلے زمانہ میں غالباً مصر وغیرہ میں ایسا رواج تھا کہ لوگ خانہ کعبہ کی شبیہ بناتے تھے اور اس کی چاروں طرف طواف کرتے تھے، چنانچہ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ صورت بھی بدعت ہے، اس لئے کہ اصل خانہ کعبہ کے سوا کسی اور مقام کا طواف خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، یا آپ (ص) کے عہد میں یا عہد صحابہ میں ثابت نہیں ہے۔

فہم قرآن کیلئے کن علوم کی ضرورت ہے؟

قرآن حکیم کو کامل طور پر سمجھنے کیلئے کن کن علوم کی ضرورت ہے ؟

ہمارے فقہاء ومفسرین نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے ، میں نے اس سلسلہ میں جو کچھ سمجھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن حکیم کو سمجھنے کے دو درجے ہیں، ایک درجہ یہ ہے کہ انسان اس کو ذکر و نصیحت کیلئے سمجھے اور اس سے ہدایت حاصل کرے ، اس اعتبار سے قرآن بہت آسان ہے ، جس کو خود قرآن نے کہا ہے کہ ولقد یسرنا القران للذکر - کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر اور نصیحت حاصل کرنے کیلئے قرآن بہت آسان کر دیا ہے ، قرآن ایسی کتاب ہے کہ آپ اس کا ترجمہ دیہات کی کسی جاہل اور ان پڑھ عورت کو بھی سنا دیں تو وہ اس کا منشا سمجھ جائے گی، یہ اس کا ایک اعجاز ہی ہے ۔

فہم قرآن کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس سے احکام کا استنباط کیا جائے ، مسائل اخذ کئے جائیں، قرآن کے الفاظ اس کے مفہوم اور اس کے مطالب ومعانی کو پوری طرح سمجھا جائے ، قرآن کے متعلقات پر عبور حاصل کیا جائے ، اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو آدمی اخذ کر سکے ، تو ظاہر ہے اس کیلئے گہرے علم کی ضرورت ہے ،ہمارے علماء نے اس کے لئے بہت سی شرطیں لکھی ہیں، لیکن اس میں چند چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں ، ایک تو عربی زبان کی واقفیت اور اس کے اسالیب اور اس کے قواعد کی واقفیت ، دوسرے علم حدیث سے واقفیت ، کیونکہ علم حدیث قرآن مجید کا بیان ہے ، تیسرے اقوام ماقبل کے حالات ، قرآن جن حالات میں نازل ہوا ہے ، ان میں بہت سی چیزیں اقوام سابقہ کی ذکر کی گئی ہیں، اس کی تاریخ سے واقف ہونا بھی ضروری ہے ، چوتھے احکام شرعیہ کے استباط کے طریقے اور ان کے اصول سے واقفیت جن کو اصول فقہ، کہا جاتا ہے ، پانچویں فقہ ، یعنی فقہی جزئیات اور فقہاء کے استباط کا علم ، جن کے ذریعہ اس کو بصیرت حاصل ہوگی اور وہ قرآن مجید سے احکام فقہیہ کا استنباط کر سکے گا ۔ یہ پانچ علوم تو میرا خیال ہے کہ بہت بنیادی ہیں جن کا علم قرآن کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے ، یوں شاید کوئی ایسا فن ہو جس کا قرآن سے قریب کا یا دور کا تعلق نہیں ہو ، اور کسی درجہ میں قرآن کو سمجھنے کے لئے اس سے مدد لینے کی ضرورت نہ ہو۔

نمازِ جنازہ کے بعد اور تدفین سے قبل دعا

نماز جنازہ کے بعد عموماً میت کے لئے دخول جنت اور قبر میں عافیت
کے لئے دعاء کی جاتی ہے کیا ایسی دعاء کا جواز ہے ؟

اس دعاء کا ثبوت نہیں، ابو داؤد کی روایت حضرت عثمان غنی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مردہ کی تدفین سے فارغ ہوتے تو کھڑے ہوتے اور فرماتے کہ اپنے بھائی کے لئے دعاء مغفرت کرو کان النبی (ص) اذا فرغ من دفن المیت وقف یلیہ فقال استغفرولا خیکم ۔ اب ان کے لئے ثابت قدمی کی دعاء کرو، اس لئے کہ ان سے سوال کیا جارہا ہے ، (۳) لیکن یہ بات آپ کے ذہن میں رہے کہ اس دعا کا ثبوت ہے دفن کرنے کے بعد ، نماز جنازہ کے بعد اور دفن سے

پہلے جو دوبارہ دعا کی جاتی ہے، اس کا حدیث میں کوئی ثبوت نہیں، اس لئے کہ نماز جنازہ خود دعاء ہے، پس ایک دعا کرنے کے بعد ابھی اس مردہ کی کیفیت اور حالت میں کوئی تبدیلی ہوی نہیں، دوبارہ پھر دعا کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

قبر پہ ہاتھ اٹھا کر دعا

اس مسئلہ سے متعلق ایک اور صاحب کا سوال ہے کہ دفن کرنے
کے بعد جو دعا کی جاتی ہے یہ ہاتھ اٹھا کر کی جائے یا بغیر ہاتھ اٹھائے۔

دعا ہاتھ اٹھا کر بھی کی جا سکتی ہے البتہ یوں کیا جائے کہ قبر کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا نہ کریں بلکہ قبلہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کریں، (۴) ابن حجر نے فتح الباری میں عبد اللہ ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی حضرت عبد اللہ ذوالبجادین کا انتقال ہوا تو
جب آپ (ص) ان کے دفن سے فارغ ہوئے تو قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہاتھ اٹھائے ہوئے دعا فرمائی، تو معلوم ہوا کہ حضور (ص) نے قبلہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، اسلئے قبر کیطرف رخ کر کے ہاتھ نہ اٹھایا جائے، کہ اس سے ایہام ہوتا ہے قبر سے سوال اور صاحب قبر سے استمداد و استعانت کا۔
گویا حاصل یہ ہے کہ نماز جنازہ کے بعد اور دفن سے پہلے دعا کا ثبوت نہیں، دفن کے بعد دعا کی جا سکتی ہے، بغیر ہاتھ اٹھائے ہوئے بھی، اور ہاتھ اٹھا کر بھی، لیکن ہاتھ اٹھا کر قبلہ رخ ہو، قبر کیطرف رخ نہ کیا جائے۔

تدفین کے بعد تلقین

تدفین کے بعد میت کو تلقین کرنے کا کوئی جواز ہے؟
اگر ہے تو کسطرح کی جانی چاہئے۔
یعنی جب مردے کو دفن کر دیا گیا ہو، اس کے بعد قبر پر کھڑے ہونا اور کہنا
کہ کہو اللہ ایک ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہمارا رب اللہ ہے، ہمارے نبی
محمد صلی علیہ وسلم ہیں، ہمارا دین اسلام ہے اس طرح کی
تلقین جائز ہوگی یا نہیں؟

حدیث میں جو الفاظ آتے ہے وہ ہیں "لقنو موتا کم۔" اپنے موتی کو تلقین کرو۔ گو اکثر شارحین حدیث نے لکھا ہے کہ موتی سے مراد وہ آدمی ہو جو موت کے قریب ہو، اور عربی زبان کے اسلوب میں اسطرح کا استعمال بہت معروف ہے کہ آدمی کو مستقبل اور حال کو سامنے رکھتے ہوئے کسی کیفیت اور صفت سے متصف کر دیا جاتا ہے، پس اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی پر جب موت کی قربت کے آثار ظاہر ہونے لگیں، تو اس کے سامنے کلمہ پڑھا جائے کہ سن سن کر اس کی زبان پر

بھی جاری ہو جائے اور آخری بات اس کی زبان سے خیر کی نکلے، اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مرنے کے بعد تلقین کی جائے یا نہیں کی جائے؟۔۔۔۔۔اس مسئلہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ وہ سنتے ہیں یا نہیں سنتے ہیں، یہ ایک مشہور مسئلہ ہے جس میں بہت پہلے سے سلف کا اختلاف رہا ہے اور خود صحابہ کے درمیان یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے، جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مردے ہماری باتیں سنتے ہیں ان میں سے بعض لوگوں نے موت کے بعد بھی تلقین کی اجازت دی ہے، جیسے شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے سفر السعادہ میں، قدیم فقہاء احناف میں صاحب فتاویٰ غیاثیہ نے، ظاہر روایت ہیکہ مرنے کے بعد تلقین صحیح نہیں ہے۔(۵) ورنہ یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ طبرانی کی حدیث ہے، مگر وہ ضعیف ہے۔

اور میرے ذہن میں جو بات آتی ہے، وہ یہ ہے کہ تلقین "امر بالمعروف" کے قبیل سے ہے، کوئی انسان جب مر جاتا ہے اور دارالجزاء میں پہنچ جاتا ہے، تو اب وہ امر بالمعروف کا مخاطب باقی نہیں رہتا ہے، انسان امر بالمعروف کا مخاطب اس وقت تک ہے جب تک وہ دنیا میں ہے، اس عالم مادہ سے جب انسان کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر وہ امر بالمعروف کا مخاطب باقی نہیں رہا، اسلئے میرا بھی نقطۂ نظر یہی ہے کہ موت کے بعد اب وہ اللہ کے حوالے ہو چکا ہے، اب اس کے بعد تلقین کے لئے کوئی اصل نہیں، اگر اللہ نے اس کو توفیق دی ہوگی تو وہ صحیح جواب دے پائیگا اور اگر اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے وہ اس توفیق سے محروم ہو تو یہ تلقین اس کے کچھ کام نہ آئیگی۔

قبر پہ پھول چڑھانا اور ٹہنی لگانا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قبر پر عذاب ہوتا ہوا محسوس فرما کر
اس پر ایک ٹہنی لگائی اور فرمایا کہ جب تک یہ سبز رہیگا مردہ
پر عذاب میں تخفیف ہوگی، ہم لوگ بھی تدفین کے بعد قبر پر ہری ٹہنی لگاتے ہیں
حضور نے تو صاحب قبر پر عذاب ہونے کی وجہ سے ٹہنی لگائی
تو کیا ہمارا یہ عمل درست ہوگا؟

صحیح سند سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ نے قبر پر ٹہنی لگائی ہے اور یہ بات بھی ارشاد فرمائی ہے کہ اس سے عذاب میں تخفیف ہوگی۔(۶)۔ بعض شارحین نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ درخت جب تک ہرے ہوتے ہیں، وہ ذکر اللہ میں مشغول ہوتے ہیں، تو ممکن ہے کہ یہ مصلحت ہو کہ جب تک وہ ٹہنی ذاکر رہے اور اللہ کا ذکر اس کی زبان حال پر رہے، عذاب میں تخفیف ہو، تاہم اکثر محققین کا خیال ہے کہ ٹہنی سے اس تخفیف عذاب کا کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ آپ (ص) کی خصوصیت ہے، اگر اس تحقیق کو درست سمجھا جائے تو پھر قبر پر ٹہنی لگانے، یا پھول چڑھانے کے کوئی معنی نہیں ہیں، لیکن اگر یہ بات مان بھی لی جائے کہ خود ٹہنی کے سبز ہونے اور اس کے ذکر الٰہی میں مشغول ہونے سے یہ تخفیف عذاب متعلق ہے اور یہ محض آپ کی خصوصیت نہیں، تب بھی مختلف نکات ہیں جن پر توجہ کی ضرورت ہے۔

اول یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی اطلاع ہوئی تھی کہ یہ شخص قبر کے عذاب میں ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ آپ (ص) نے ان کے بارے میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ انھما لایعذبان فی کبیر، یہ کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب میں مبتلا نہیں ہیں، بلکہ ایک ایسی بات کی وجہ سے جس کو تم لوگ معمولی گناہ سمجھتے ہو، تو معلوم یہ ہوا کہ آپ (ص) کو بذریعہ وحی اس کا مبتلاء عذاب ہونا معلوم تھا، اگر ہم کسی مسلمان کی قبر پر ٹہنی لگاتے ہیں تو اس کے بارے میں یہ سوء ظن رکھتے ہیں کہ وہ عذاب میں مبتلا ہے، حالانکہ کسی مسلمان کے بارے میں اس طرح کا گمان روا نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس کے باوجود مان لیا جائے کہ امکانی طور پر عذاب سے بچنے کیلئے ٹہنی لگائی جائے تو پھر ایسے لوگوں کی قبر پر ٹہنی لگائی جانی چاہئے جو انتہائی فاسق وفاجر ہوں اور جن کی معصیت آمیز زندگی ہمارے سامنے ہو، شرابی ہوں، کبابی ہوں معاشرہ میں ان کا فساد ظاہر ہو، ان کی قبروں پر جائے اور ٹہنیاں لگائے، لیکن وہ لوگ جن کو ہم اولیاء اور صالحین کہتے ہیں، اور جن کے بارے میں ہم باور کرتے ہیں کہ ان کا فیض دنیا کے مختلف گوشوں اور چپوں میں عام ہوا ہے، اور لاکھوں انسانوں کو ان کے ذریعہ ہدایتیں حاصل ہوئی ہوں، میں نہیں سمجھتا کہ ان قبروں پر ٹہنی لگانے کا کیا مقصد ہے؟ گویا ہم ان کو سوسائٹی کا سب سے بڑا گنہگار تصور کرتے ہیں، بس ایک طرف آپ ان کو ولی بھی کہتے ہیں اور دوسری طرف اپنے عمل کے ذریعہ انہیں کو بدترین درجہ کا گنہگار بھی قرار دیتے ہیں، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اپنے بزرگوں کے ساتھ عقیدت میں ایسا عمل کرتے ہیں، وہ دراصل ان کے ساتھ عملاً سوء ظن کا ثبوت دیتے ہیں۔

تیسرے، ہمارے یہاں جو لوگ قبر پر کچھ رکھتے ہیں، وہ ٹہنی تو لگاتے نہیں ہیں، گلاب کا پھول یا کسی اور پھول کی چادر چڑھاتے ہیں، یہ تشبہ بالکفار ہے، آپ نے دیکھا ہو گا کہ برادران وطن میں یہ عام رواج ہے، اسلام کا مزاج یہ ہے کہ ہماری عبادت میں بلکہ ہماری معاشرت میں یہاں تک کہ ہمارے سر کے بال، اور لباس میں بھی غیر مسلموں کے مقابلہ امتیاز ہونا چاہئے، مکہ مکرمہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ کفار مانگ پھاڑتے ہیں، تو آپ (ص) نے فرمایا کہ سیدھا بال رکھو تاکہ تمہارے اور غیر مسلموں کے درمیان امتیاز قائم رہے، مدینہ تشریف لے گئے تو اہل کتاب کو دیکھا کہ سیدھا بال رکھتے ہیں، اب آپ نے فرمایا کہ مانگ پھاڑا کرو، اب مانگ پھاڑ کر مسلمان، ہم وطن غیر مسلموں سے خود کو ممتاز کر سکتے تھے، پھر جب بعد کو پورا جزیرہ العرب دامن اسلام میں آگیا تو آپ نے فرمایا کہ دونوں طرح بال رکھ سکتے ہو، مانگ نکال بھی سکتے ہو اور سیدھا بال بھی رکھ سکتے ہو، اسلئے کہ اب کفار سے تشبہ کا مسئلہ باقی نہیں رہا، اب جس دین میں اس درجہ امتیاز کو پسند کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مقابلہ نمایاں رکھا گیا ہو کیا وہ اس بات کو پسند کرے گا کہ ان معاملات میں، ہم وہ طریقہ اختیار کریں جو غیروں کا ہے، اسلئے ہمارے یہاں جو اس کی صورت مروج ہو گئی ہے، وہ بالکل نادرست اور ناروا ہے۔

مروجہ گیارہویں

گیارہویں جو اس ماہ میں دھوم کے ساتھ کی جاتی ہے اس کی شرعی حیثیت واضح فرمائے۔

یہ تو ہمارے معاشرے کا بڑا حساس مسئلہ بن گیا ہے، ہمارے یہاں اسلام میں سالگرہ یا برسی کا کوئی تصور نہیں ہے، جناب رسول للہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اور اس کے بعد تیس سال تو خود حدیث نبوی کے مطابق خلافت راشدہ کا دور رہا، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے کبھی بارہ وفات منائی ہو یا نو تاریخ کو جو آپ (ص) کی تاریخ ولادت تھی یوم میلاد منایا ہو اور کوئی اہتمام کیا ہو، کوئی تقریب منائی ہو، دعوت کی ہو، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کا امت پر سب سے زیادہ احسان ہے اور جن پر صلوہ وسلام بھیجنا امت پر فرض ہے اور جن کے ذکر پر زبان کے درود وسلام کی تراوٹ سے محروم رہ جانے سے بڑھکر خود آپ کے ارشاد کے مطابق کوئی اور بخل نہیں کبھی برسی نہ منائی گی تو دوسروں کی برسی منانی کسطرح جائز ہوگی؟ دنیا کے بعض مذاہب اور اقوام ایسی ہیں کہ ان کے پاس گنے چنے لوگ ہیں، ان کے پاس افراد بہت کم ہیں، آپ عیسائیوں کے یہان دیکھئے، ان کے یہاں مذہبی شخصیات و مصلحین کی تعداد بہت کم ہے، لیکن مسلمانوں کا معاملہ تو ایسا ہے کہ ان کی پوری تاریخ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کے مصداق ہے، کوئی دن ایسا نہیں کہ کسی بزرگ اور اللہ کے کسی بہت بڑے بندے کی وفات نہ ہوئی ہو، تو اگر ہم اسطرح کی بارہ وفات منائیں تو سال کا کوئی دن ایسا نہ ہوگا کہ کسی نہ کسی کی برسی نہ منانی پڑے اور اس میں ایک اور غلطی ہے کہ تاریخی اعتبار سے حضرت شاہ جیلانی کی تاریخ وفات گیارہ ربیع الثانی ہے ہی نہیں، آپ ان کی سیرت کی کتابیں دیکھئے تاریخ وفات میں گو اختلاف ہے، لیکن ۱۱ ربیع الثانی کا تو کوئی قول ہے ہی نہیں، معلوم نہیں کس طرح یہ بات مشہور ہوگی، اسلئے اس کی کوئی اصل نہیں اور یہ بدعت ہے۔

بیرون ملک عورت کا تنہا سفر

اسلام میں تنہا عورت کو سفر کرنے کی اجازت نہیں، موجودہ دور میں عورتوں کو
بیرون ملک کا سفر تنہا کرنا پڑتا ہے، اسلئے کہ اس کے شوہر وہاں رہتے ہیں
اس حالت میں عورت تنہا سفر کر سکتی ہے یا نہیں؟

فقہاء نے اس سلسلہ میں جو اصول لکھا ہے وہ تو یہی ہے کہ جہاں کی مسافت تین دن ورات کی ہو، چاہے یہ مسافت ایک گھنٹہ ہی میں کیوں نہ طے کرلی جائے، اس میں عورت کیلئے ضروری ہے کہ شوہر یا کسی محرم کے ساتھ سفر کرے تنہا سفر نہ کرے، الایہ کہ کوئی بہت ہی ناگزیر قسم کی مجبوری ہو جائے تو حالات و مصالح کے تحت میرا خیال ہے کہ مفتی بعض صورتوں کو اس سے مستثنی کر سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب نے مکہ سے مدینہ کا سفر فرمایا، اس سفر میں ان کے ساتھ صرف حضرت زید تھے، کوئی محرم رشتہ دار ساتھ نہ تھے، پس ایمان کی حفاظت، عزت کی حفاظت، یا جان کے بچانے یا انسان کی حفاظت کیلئے ناگزیر

ہوجائے تب تو اور بات ہے، ورنہ عام حالات میں اسطرح تنہا سفر کرنا جائز نہیں، بلکہ شوہر کو چاہیے خود آکر بیوی کو لے جائے۔

فرائض کے بعد دعا کی مقدار

جن فرض نمازوں کے بعد سنت مؤکدہ ادا کرنی ہوتی ہے، امام کا مختصر دعاء کرنا اور جن نمازوں کے بعد کوئی سنت نہیں ہے امام کا قدرے طویل دعاء کرنا کیا یہ بات فقہاء نے لکھی ہے؟

جن نمازوں کے بعد سنت مؤکدہ ہو ان نمازوں کے بعد دعاء مختصر کی جانی چاہئے، (؟) بعض روایات میں صراحت ہے کہ آپ مشہور دعاء " اللھم انت السلام ومنک السلام وتبارکت یاذالجلال والاکرام" سے زیادہ طویل دعا نہ فرماتے البتہ جن نمازوں کے بعد کوئی سنت نہیں مثلاً فجر کی نماز اور عصر کی نماز ہے، اس کے بعد طویل دعاء کی جائے اور تسبیحات بھی پڑھی جائیں اور یہ بھی آپ (ص) کا معمول تھا جواب متروک ہوگیا ہے کہ ان نمازوں کے بعد حضور (ص) صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے، صحابہ مسائل دریافت کرتے، خواب کی تعبیر پوچھتے، اور آپ جواب دیتے یا اگر کوئی بات بطور خود توجہ دلانے کی محسوس کرتے تو صحابہ کو تنبیہ فرماتے۔

بے پردگی

ہماری جو عورتیں بے پردہ پھرتی ہے اور جسم کی نمائش کرتی ہیں ان کا یہ گھر سے بے پردہ نکلنا جائز ہے اور ان کے اس طرح گھر سے نکلنے پر مرد یعنی باپ، بھائی، شوہر اس کے ذمہ دار ہونگے یا نہیں؟ تفصیل سے جواب دیں آج کل یہ عام مرض ہے۔

یقیناً یہ جائز نہیں اور یقیناً اس میں وہ مرد بھی ذمہ دار ہوں گے جنہوں نے ان کو اجازت دی ہوگی یا ان کو اس عمل سے باز رکھنے کی سعی نہ کی ہوگی، ایک روایت سے ثابت ہے کہ حضور (ص) نے فرمایا ہے بچے بالغ ہوجائیں اور اولیاء ان کا نکاح نہ کریں یہاں تک کہ وہ گناہ میں مبتلا ہوجائیں تو جتنا گناہ ان بچوں پر ہوگا اسی درجہ گناہ ان کے ماں باپ پر ہوگا، تو ظاہر ہے کہ زنا کا تو گناہ تو بہت سنگین ہے، جب اس میں حضور (ص) نے والدین کی بے پرواہی کی صورت میں ان کو شریک گناہ قرار دیا تو بے پردگی میں بدرجہ اولیٰ والدین بھی شریک ہوں گے، اسلئے وہ مرد بھی ضرور اس میں ملزم ٹھہریں گے جنہوں نے اس کی اجازت دی ہے، آپ (ص) نے ایک اصول بیان فرمادیا ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص اپنے زیر ذمہ لوگوں کے بارے میں جوابدہ ہے۔

چرم قربانی

چرم قربانی کی وصول شدہ رقم سے دینی و دنیوی تعلیم دی جاسکتی ہے ؟
کیا چرم قربانی کی رقم سے مدرسہ کی عمارت بنوائی جاسکتی ہے ؟
کیا چرم قربانی کی رقم سے غریب لڑکیوں کی شادی وغیرہ کرائی جاسکتی ہے ؟

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ چرم قربانی جب تک چرم کی شکل میں ہو، اسکا ہر ایک کیلئے استعمال کرنا جائز ہے چاہے خود استعمال کرے چاہے دوست اور قرابت دار کو دیدے، کسی صاحب استطاعت کو دیدے، یا نادار کو دیدے، اس میں وہ تصرف کرنے کا پوری طرح مجاز ہے، لیکن چرم قربانی کے جانور کا کوئی جزء فروخت کر دیا جائے تو اب فقہاء لکھتے ہیں کہ وہ واجب التصدق ہے، اس کو صدقہ کر دینا واجب ہے، یہ صرف چرم ہی کا مسئلہ نہیں ہے، گوشت کا بھی یہی مسئلہ ہے، گوشت کھاسکتے ہیں، لیکن اگر قربانی کا گوشت کسی شخص نے بیچ ہی دیا تو اب اس کا اپنی ضرورت پر صرف کرنا جائز نہیں، ضروری ہے کہ اس کو صدقہ کر دیا جائے، اسلئے چرم قربانی بھی صدقات واجبہ ہی ہے، اور ان کو غرباء پر خرچ کر دیا جانا واجب ہے، صدقات واجبہ کا حکم فقیر پر خرچ کے جانے کے معاملہ میں وہی ہے، جو زکوۃ کا ہے، اسلئے نہ اس کے ذریعہ اجرت ادا کی جاسکتی ہے، اور نہ ہی ایسے مدات میں خرچ کی جاسکتی ہے جس میں کسی کو مالک نہیں بنایا جائے، اب ظاہر ہے کہ اساتذہ کی تنخواہ اجرت ہے، اور اجرت میں یہ رقم صرف ہو نہیں سکتی، عمارت میں یہ رقم خرچ کی جائے تو اس رقم کا کسی کو مالک نہیں بنایا جاسکتا اسلئے کہ عمارت کوئی زندہ اور باشعور چیز تو ہے نہیں، جس میں مالک بننے کی صلاحیت ہو

ہاں! جہاں تک غریب لڑکیوں کی شادی میں امداد کا مسئلہ ہے تو یہ درست ہے، بشرطیکہ لڑکی یا اس کا ولی صاحب نصاب نہ ہو، بلکہ موجودہ زمانہ کے حالات کے تحت اس مد میں ضرور مدد کی جانی چاہئے اور یہ بہترین مصرف ہے۔

****

حواشی و حوالہ جات

(۳) سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۴۵۹

(۴) عالمگیری میں ہے واذا اراد الدعاء یقوم مستقبل القبلۃ ج ۵ ص ۳۵۰

(۵) واما تلقین بعد الموت فلا یلقن عندنا فی ظاہر الروایہ، عالمگیری ج ۱ ص ۱۵۱

(۶) ابو داؤد عن ابن عباس ج ۱ ص ۴

(۷) الامام اذا فرغ من الظہر والمغرب والعشاء یشرع فی السنۃ ولا یشتغل بادعیۃ طویلۃ عالمگیری ج ۱ ص ۷۷

نقد و تبصرہ

دعوتی و فکری موضوع پر پانچ کتابیں

مولانا سرفراز احمد قاسمی
مولوی خالد حسین صدیقی

ناشر۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز لمرادی روڈ بٹلا ھاوس نئی دہلی ۔۲۵

ملنے کا پتہ قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹر و بیج بلڈنگ نظام الدین ولسیٹ نئی دہلی ۱۳

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز دہلی کا قیام ، دینی و ملی رجحان کے ساتھ چند سال پہلے ہوا ہے ، اسکے روح رواں ڈاکٹر منظور عالم صاحب ہیں انکی جد و جہد اور لگن سے انتہائی اہم دینی ملی و علمی کام اس ادارہ نے ابتک انجام دیا ہے ، کئی گرانقدر علمی کتابیں اس ادارہ سے منظر عام پر آچکیں ہیں اللہ کے فضل سے ملک و بیرون ملک کے چیدہ اور جید علماء کا تعاون اور سرپرستی روز اول سے ادارہ کو حاصل ھے ----- ادارہ نے اس بات کا اہتمام کیا ھیکہ دعوتی و فکری موضوعات پر چھوٹے چھوٹے کتابچے آسان اور سھل زبان میں شائع کئے جائیں جسکی زبان عام فھم ہوتا کہ عامۃ الناس بھی زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں ، ان رسائل میں قطعی طور پر دقیق علمی مسائل اور اختلافی موضوعات سے گریز کیا گیا ہے ذیل میں ان پانچوں کتابوں کا تعارف پیش ہے ----

"س"

(۱) نام کتاب ۔ مسلک کا فرق اور ملی اتحاد صفحات (۴۱)
نام مصنف ۔ مولانا محمد عبد اللہ طارق دہلوی قیمت (۶ روپیئے)

اسلام کو جس چیز نے سب سے زیادہ نقصان پہونچایا ہے وہ مسلمانوں کا جزوی اور وقتی مسائل میں آپس کا اختلاف ہے اگر دین کو بنیاد بنا کر مسلکی اختلاف کی اصل اور اساس تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ مسلک کے اختیار میں شدت اور کفر و ایمان کا مجھکر طعن و تشنیع کا شیوہ شریعت اسلامیہ کی روح سے میل کھاتا نظر نہیں آتا ، منصف موصوف جو مشھور صاحب قلم ہیں اور کئی دینی و علمی کتابوں کے مصنف ہیں ، نے اس موضوع پر انتہائی سنجیدہ اور شستہ لب و لہجہ میں مسلک کا فرق اور ملی اتحاد کی غرض اور اسکی روح کو دعوتی انداز میں بیان کیا ہے ، موصوف نے صحابہ کرام کے واقعات کثرت سے ذکر کئے ہیں ، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف مسلک کے باوجود انکے اندر کتنی قوت کے ساتھ ملی اتحاد کا نظام کار فرما تھا ، نیز اسلام میں کسقدر اختلاف رائے کو

برداشت کرنے کی صلاحیت ہے ۔۔
امید ہے کہ حقیقت پسند اور دینی درد رکھنے والے حضرات اس کتاب کو خود پڑھیں گے اور دوسروں تک پہونچائیں گے ۔
"س"

(۲) نام کتاب ۔ مسلک کا فرق صفحات (۴۱)

نام مصنف ۔ مولانا محمد عبداللہ طارق دہلوی قیمت (۵ روپے)

اسلام ایک امت وحدت ہے کالے گورے ، عربی ، عجمی غرض کہ نسل و برادری کی تمام امتیازات کو نبی (ص) امی نے یکسر ختم کردیا اور واضح طور پر نسبی اور نسلی تفاخر کی مذمت کر کے امت کیلئے فخر و بڑائی کی چیز تقویٰ کو قرار دیا ہے اور عصبیت کو جاھلی صنف بتایا ہے ۔ عصبیت نے اسلام کی نشر و اشاعت میں کتنی دشواریاں پیدا کی ہیں اور ملت کتنے فرقوں میں بٹی ہے تاریخ گواہ ہے ، مصنف نے کتاب و سنت اور حدیث نبوی (ص) سے اسکی قباحت اور ضرر کو بیان کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ھیکہ اسلام میں عصبیت کی کوئی جگہ نہیں نہ وطنی نہ خاندانی! ۔۔۔۔ مصنف نے صفحہ ۳۲ پر لکھا ھیکہ آج یہ تجربہ ہماری صفوں میں بری طرح سرایت کرچکا ہے جو ہماری قومی و ملی بنیادوں کو تیزی سے کھوکھلا کرتا جارہا ہے مصنف نے یہ لکھکر دینی و ملی جماعتوں کے ذمہ دار اور کارکنوں سے گذارش کی ھیکہ وہ سنجیدگی سے اس مسئلے پر سوچیں اور تفرق کی فضا کو ختم کریں اور ذیل کے شعر پر اپنی تحریر ختم کی

ہے ۔ آغیریت کے پردے ایک بار پھر اٹھادیں
بچھڑوں کو پھر ملادیں ، نقش دوئی مٹادیں

(۳) نام کتاب ۔ عظمت مومن صفحات (۲۸)

نام مصنف ۔ مولانا محمد عبداللہ طارق دہلوی ۔ قیمت (۵ روپے)

دنیا کے تمام مادی رشتوں سے بڑھکر اسلام کی نگاہ میں ایمانی رشتہ ہے ۔ قرآن کی زبان میں " انما المومنون اخوۃ ۔ مسلمان آپسمیں بھائی بھائی ہیں ، مصنف نے اس بات کی کوشش کی ھیکہ کتاب و سنت سے ایسی آیات و روایات کو پیش کریں جسمیں اس بات کی نشاندہی اور رہنمائی کی گئی ہو کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے کیسا برتاؤ ہونا چاہئے اور کس طرح اسکے حقوق کی پاسداری کی جائے انبیاء کے سواء ہر انسان میں فطری کمزوری ہوتی ہے ۔ اگر اسکو نظر انداز کردیا جائے اور اسکی

خوبیوں کو بیان کیا جائے تو یہ بات اس سے بہتر ھیکہ اسکے کمزوریوں کی تشہیر کی جاتے ۔ اور اسکی عزت نفس پر حملہ کیا جائے ۔ مصنف نے صفحہ ۱۶ پر حضرت مسطح بن اثاثہ (رض) کے واقعہ کے بعد لکھا ھیکہ کسطرح حضرت ابوبکر (رض) کے فیصلہ پر قرآن نے حسن سلوک اور احسان سے باز آنے سے روک دیا جبکہ حضرت مسطح (رض) کی غلطی کتنی شدید تھی ، ہر انسان اس کا اندازہ کرسکتا ہے ۔

"س"

(۴) نام کتاب ۔ اتحاد ملت صفحات (۳۲)

نام مصنف ۔ مولانا محمد عبداللہ طارق دہلوی قیمت (۵ روپے)

اتحاد کی اہمیت وافادیت سے کون انکار کرسکتا ہے اور اتحاد کے فقدان کی صورت میں اقوام و ملل کو کس قسم کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے ۔ اس سے بھی کوئی ناواقف نہیں ، لیکن اسکی اہمیت اسوقت اور بڑھ جاتی ہے جبکہ ہماری شریعت نے باربار اسکی تاکید کی ہے ، مصنف نے قرانی آیات اور احادیث نبوی (ص) پیش کرکے اسکی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کی ہے ، مصنف نے برملا اس کا اظہار کیا ہے کہ اتحاد ، ایک میٹھا پھل ضرور ہے اور شخص اسکے حصول کا متمنی ہے لیکن اس کا حصول اتنا ھی دشوار ہے کیونکہ یہ قربانی چاہتا ہے ۔ نفس کی ، مال کی جھوٹی عزت کی مصنف نے جس جذبہ کے تحت زخم دل بیان کرنے کی کوشش کی ہے ، خدا سے دعا ھیکہ وہ انکی اس تحریر سے امت مرحومہ کو فائدہ پہونچائے ۔

(۵) نام کتاب ۔ اسلامی معاشرہ میں مساجد کا کردار صفحات (۳۲)

نام مصنف ۔ مولانا محمد مسعود عالم قاسمی قیمت (۶ روپے)

کسی مسلم معاشرہ میں مسجد کا وجود اہل قریہ کی دین کے ساتھ تعلق کی گواہی دیتا ہے ۔ لیکن دور حاضر میں مساجد کو جن مقاصد کیلئے استعمال کیا جاتا ہے ۔ خاصکر مسلکی اختلاف کی وجہ سے مساجد کو وحدت امت کی علامت بننے کے بجائے تفریق ملت کا ذریعہ بنایا جارہا ہے ۔ ظاہر ہے یہ مسجد کا احترام نہیں بے حرمتی ہے ، اسلامی تعلیمات اسکی اجازت نہیں دیتی ہے ، مسجدوں میں جاکر خشیت الہی ، رجوع الی اللہ کی کیفیت کا پیدا ہوجانا ، شیطانی وساوس واعمال سے خود کو دور رکھنا ، تمام دینی و دنیوی امور میں مساجد کا جو کردار تھا ، وہ مفقود نظر آتا ہے ۔ مصنف نے انکی اہمیت کتاب و سنت سے واضح کرتے ہوئے اس بات کا بھی رونا رویا ہے کہ آجکل ہماری مساجد میں فرقہ بندیوں اور انتشار و زبوں حالی کا جو نظام رائج ہوتا جارہا ہے وہ کتنا مضر اور نقصان دہ ہے ، اور مسلمانوں کے

سارے اختلافات کی تان مسجد ہی میں ٹوٹتی ہے

یہ تمام رسائل، اتحاد ملت ہی کے موضوع پر مختلف گوشوں کو واضح کرتے ہیں اور مسلمانوں کیلئے لمحات فکر فراہم کرتے ہیں، زبان عام فہم و شستہ، گفتگو استدلالی اور نصح و موعظت سے بھرپور، مضمون عبرت خیز و سبق آموز اور اس حسن باطن کے ساتھ بہ بقامت کثیر بقیمت بہتر" رسائل ظاہری حسن و کشش سے بھی معمور اور جاذب نظر ہیں، اور کتابت و طباعت نیز سرورق عمدہ و دلکش ہے، ----- عوام و خواص، جدید و قدیم، تعلیم یافتگان، نوجوان، تحریکوں اور تنظیموں کے ذمہ داران اور مسلم زعماء و سربرآوردگان کے لئے یہ سارے رسائل نہایت قیمتی اور مطالعہ کے لائق ہیں۔

نام کتاب۔ نماز صحت جسمانی اور بیماریوں سے روک تھام

مصنف۔ محمد رفیع الدین فاروقی (ایم ،اے ،ایل ،ایل ،بی)

ناشر۔ القلم پبلشرز سعید آباد

صفحات (۳۶)

یہ سائنٹفک دور ہے جسمیں لوگوں کا مزاج ہر چیز کو منطقیانہ اور مادی انداز میں سمجھنے کا عادی ہو گیا ہے، خاصکر جدید نسل نے اس کی تمام حدود پھلانگ لی ہے۔

اسلام جو ایک عالمگیر، آفاقی، اور فطری مذہب ہے، اسمیں روح کی اصلاح کے ساتھ جسم کی اصلاح کا بھی نظم کیا گیا ہے۔ اسلامی عبادات اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔،----- ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلامی عبادات کے جسمانی فوائد کو جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں ثابت کیا جائے، محترم رفیع الدین فاروقی صاحب ----- جو ایک ذی علم آدمی ہیں ----- نے اس سمت پیش قدمی کی ہے اور نماز صحت جسمانی اور بیماریوں سے روک تھام نامی کتاب لکھ کر وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے، مصنف نے بڑی ژرف نگاہی اور دقت نظری سے وضو، غسل، نماز کے مختلف ارکان --- قیام، رکوع، سجود، قومہ، قعدہ --- کے فوائد کی تحقیق کی ہے، اور مختلف مروجہ ورزشوں سے نماز کا مقابلی جائزہ پیش کیا ہے، جسمیں مصنف نے لائق ستائش کامیابی حاصل کی ہے۔

کی جگہ کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں، ایک دو جگہ نظریاتی اختلاف ہو سکتا ہے، کتاب مجموعی لحاظ سے جامع، سادہ، سلیس، اور شگفتہ ہے، اور خاص و عام کیلئے یکساں طور پر قابل مطالعہ اور مفید ہے

*************** -

خبرنامہ: دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

مرتبہ: محمد یعقوب منظہر

مورخہ ۱شوال ۱۴۱۰ھ کو ہر سال کی طرح اس سال بھی داخلہ شروع ہوگیا۔ امسال دارالا قامہ میں طلباء کی تعداد چار سو سے متجاوز ہے، تخصص فی الفقہ (سال اول) میں بھی اسکالرشپ کے ساتھ پانچ اور تخصص فی الدعوہ میں بھی اسی خصوصی وظیفہ کے ساتھ پانچ طلبہ کا داخلہ قبول کیا گیا۔

مورخہ ۹ ذیقعدہ کو جامع ہذا میں بخاری شریف کے درس کا آغاز اور شعبہ تخصص فی الدعوہ کا افتتاح عمل میں آیا، امسال اس پر وقار تقریب کے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی (صدر مفتی دار العلوم کراچی) اور حضرت مولانا محمد حنیف ملی، شیخ الحدیث معہد ملت مالیگاؤں مدعو تھے، مولانا عثمانی نے بخاری شریف کا افتاح فرمایا اور اخلاص نیت کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالی، مولانا ملی نے دعوت دین کی اہمیت اور علماء ھند کی خدمات، علم حدیث میں بعض نئے گوشوں پر کام کی ضرورت وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے مبسوط اور فاضلانہ خطاب فرمایا اور دونوں ہی حضرات نے جامعہ ھذا کی تعلیمی خدمات کی ستائش کی۔

اسلامی فقہ اکیڈمی کے تحت تیسرا فقہی سمینار مورخہ ۱۴\۱۵\۱۶\۱۷ ذیقعدہ کو دار العلوم سبیل ارشاد بنگلور میں منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں حضرت ناظم صاحب، مولانا خالد سیف اللہ صاحب صدر مدرس، مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب شیخ الحدیث اور مولانا مصطفی مفتاحی استاذ حدیث جامعہ ھذا سے مدعو تھے۔ چنانچہ ان تمام حضرات نے سیمینار میں شرکت فرمائی۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اور مولانا زبیر احمد قاسمی نے سیمینار کے درمیان اپنے مقالات بھی پیش کئے، نیز اسلامی بنک کاری کے موضوع پر غور کرنے کیلئے ماہرین معاشیات اور علماء فقہ کی جو بارہ رکنی کمیٹی بنائی گئی، اسی میں رکن کی حیثیت سے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کو بھی نامزد کیا گیا۔

مورخہ ۳ ر ذوقعدہ کو مولانا مفتی عبد الودود صاحب سفر حج کیلئے تشریف لیگئے اس موقعہ سے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب، مولانا زبیر احمد قاسمی صاحب، مولانا فضل الرحمن صاحب قاسمی اور دیگر اساتذہ وطلبہ اسٹیشن پر رخصت کرنے کیلئے موجود تھے۔ مورخہ ۸ محرم الحرام ۱۱ھ کو مولانا موصوف کی بخیر وعافیت واپسی ہوئی، سکندرآباد اسٹیشن پر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب، مولانا عتیق الرحمن صاحب، قاری غلام ربانی صاحب اور دوسرے اساتذہ وطلبہ نے استقبال کیا ---------- ۱۴ محرم الحرام کو بعد نماز ظہر حضرت ناظم کی زیر صدارت مولانا موصوف کا، تہنیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں موصوف نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور تمام لوگوں کیلئے دعائیں کیں۔

مورخہ ۶ ذی الحجہ تا ۱۵ ذی الحجہ جامعہ ہذا میں تعطیل رہی اور اساتذہ وطلبہ نے چرم قربانی کی فراہمی کا کام پوری دلچسپی سے انجام دیا---- مدرسہ میں امسال بھی قربانی کا نظم کیا گیا تھا۔ چنانچہ ۷۵ جانوروں کی قربانی ہوئی۔

مورخہ ۲۰ ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ کو عراق کے بلند پایہ عالم ڈاکٹر محروس المدرس فقہی سمینار میں

شرکت کے بعد حیدرآباد تشریف لانے دو دنوں مدرسہ میں قیام فرمایا۔ مولانا صدرالحسن ندوی استاذ مدرسہ کاشف العلوم اورنگ آباد بھی اس موقعہ سے تشریف لانے ------- مئورخہ ۲۰ رذیقعدہ کو جی بعد نماز عشاء طلبہ کی طرف سے ان مہمانوں کی استقبالیہ کا نظم کیا گیا، جس میں سے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس مدرسہ ھذا نے عربی زبان میں مدرسہ ھذا کا تعارف کرایا، پھر مہمانوں کا خطاب ہوا۔ ڈاکٹر مُروس نے مدرسہ کے نظام اور اسکی خدمات پر گہرے تاثر کا اظہار فرمایا۔ اخیر میں حضرت ناظم صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور ان کے مشوروں کو سراہا۔

مئورخہ ۱۸ ذوقعدہ۔ کو مولانا مجیب اللہ ندوی مدیر الرشاد۔ اعظم گڈھ اور مولانا طاہر مدنی تشریف لانے۔ جامعہ کی تعلیمی شعبہ جات، اسکے نصاب تعلیم اور تخصص فی الفقہ کے کام کا بنظر غائر جائزہ لیا اور اسکی ستائش کی۔

مئورخہ ۱۲ محرم الحرام کو مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اور مولانا مصطفیٰ مفتاحی صاحب نوجوانان کرنول کی طرف سے منعقد ہونے والے یاد حسین کے جلسہ کو خطاب کرنے تشریف لے گئے۔ اس موقعہ سے ان حضرات نے وہاں کے بعض دینی مدارس اور بعض دینی کاموں کا معائنہ بھی فرمایا۔

مئورخہ ۲۷ شوال ۱۴۱۱ کو جامعہ ہذا میں اسباق کا افتتاحی اجلاس ہوا جس میں حضرت ناظم صاحب، جناب صدر مدرس صاحب، شیخ الحدیث صاحب اور دوسرے اساتذہ نے خطاب فرمایا اور طلبہ کو مفید نصیحتیں کیں۔

مئورخہ ۲۰ ذی الحجہ کو طلبہ کے تحریری اور تقریری پروگرام کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا، جس میں بعض طلبہ کے علاوہ جناب صدر مدرس صاحب، مولانا برکت اللہ صاحب استاد حدیث اور مولانا عتیق الرحمن صاحب استاذ حدیث نے خطاب فرمایا اور تقریر و تحریر کے سلسلے میں بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی۔ جناب صدر مدرس صاحب نے امسال طلبہ کے پروگرام کے لئے انہی میں سے درج ذیل طلبہ کو ذمہ دار نامزد فرمایا۔

ناظم تقریر	مصلح الدین (ہفتم عربی)
معاون	عبدالحفیظ قادری (ہفتم عربی)
ناظم تحریر	امتیاز احمد (ہفتم عربی)
معاون	محمد انظر (ہفتم عربی)
ناظم کتب خانہ	محمد ظفر الاسلام (ہفتم عربی)
معاون	شیخ مرتضیٰ (ششم عربی)

مئورخہ ۲۷ ذوقعدہ ۱۴۱۰ھ جامعہ عائشہ (نسواں) داراب جنگ کالونی میں افتتاح بخاری کا اجلاس سرپرست جامعہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے زیر نگرانی اور مولانا محمد رضوان القاسمی کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ مولانا مفتی اشرف علی صاحب، شیخ الحدیث دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور

(باقی صفحہ ۵ پر)

ضروری اعلان

◐ "اسلامک فقہ اکاڈمی ہند" نے طے کیا ہے کہ مورخہ ۶/۷/۸/۹/ شعبان ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۲/۲۳/۲۴/۲۵/ فروری ۱۹۹۱ء، جمعہ، ہفتہ، اتوار، پیر کو اکاڈمی کا چوتھا سمینار دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں منعقد ہوگا ـــــ قارئین سے اس کی کامیابی کے لئے دعاؤں کی خصوصی درخواست ہے۔

◐ اس موقع سے دو سو صفحات پر مشتمل "صفا" کا خصوصی شمارہ طبع ہوگا، جو فقہ اسلامی اور علماء ہند کی فقہی خدمات پر انشاءاللہ ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہوگا۔ "صفا" کا یہ شمارہ تیسری جلد کا تیسرا اور چوتھا مشترکہ شمارہ ہوگا ـــــ جو لوگ جنوری کے اواخر تک "صفا" کے ممبر بنیں گے، ان کو یہ اہم اور خصوصی شمارہ بھی مل سکے گا۔

(ادارہ)

○ سرخ نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے۔ براہِ کرم آپ "صفا" سے اپنا تعاون جاری رکھیں اور بہ عجلت اپنی سالانہ زرِ خریداری روانہ کریں۔